

سہری

اسے روکتے ہوئے رو کر دیا۔
 ”اچھی طرح پتا ہے، یہ سالوں کی گمشدہ بچھیاں
 اچانک اپنے گھروں کے ساتھ وطن واپسی کا پروگرام
 کیا سوچ کر بناتی ہیں۔ ویسی قسم کی بسوئیں تلاش
 کرنے اور ایسے گھر اگر اپنے ہی خاندان میں جا بجا
 بکھرے ہوئے ہوں تو کیا ہی کہنے۔“ بیلا نے میرے
 دل کی بات کہی۔

”اور پھر امپورٹڈ بیٹوں کی ماں ہونے کی حیثیت سے
 جو پروٹوکول ملتا ہے وہ عیاشی الگ۔“ رحمہ نے اسکیج
 بناتے بناتے پنسل روک کر ایک اور اہم نکتے کی طرف

بڑی امی کی طرف سے دی گئی یہ خبر خوش کن نہ
 سی، حیران کن ضرور تھی اور اس وقت چودھری ہاؤس
 کی تمام ”بکریاں“ نمکین تلی ہوئی مونگ پھلی اور وال
 مونگ چرنے کے ساتھ ساتھ اس تازہ ترین اطلاع پہ
 جی بھر کے تبصرے بھی کر رہی تھیں۔

”امی نے یہ بھی بتایا ہے کہ شعبنم پھوپھو اتنے سالوں
 بعد اپنے صاحبزادوں کو لے کر پاکستان محض تبدیلی آب
 و ہوا کی خاطر نہیں آرہیں بلکہ۔“

”پتا ہے پتا ہے۔۔۔ بس۔“ بیلا اپنی دانست میں جو
 انکشاف کرنے جا رہی تھی وہ میں نے ہاتھ اٹھا کے

مکمل ناول



توجہ دلائی۔
 ”مور کیا تم دیکھ لیتا۔ یہ جینم پھوپھو جنہوں نے
 اتنے سال کسی عزیز رشتے دار سے رابطہ تک رکھنا
 گوارا نہ کیا، ان کی اتنی کو بھگت ہو گی۔ برساتی
 مینڈکوں کی طرح ایسے ایسے دور پرے کے رشتے دار
 نکل آئیں گے انہیں مدعو کرنے جن کا ہم تک وہ نہ
 جانتی ہوں گی۔ ان کے تو مزے ہی مزے، وی وی آئی
 بی کی طرح یہ ڈیڑھ مینڈک گزاریں گی وہ۔ سارا خاندان
 ہاتھوں ہاتھ لے گا ایک اعزاز کی طرح ان کی میزبانی کا
 شرف حاصل کیا جائے گا۔“ میں نے بیٹھ کر کوئی کی
 جس کے جواب میں بیٹا نے ہلکا سا استہزائی قہقہہ لگایا۔
 ”آئی اور آئی تو جیسے یہ موقع ہاتھ سے جانے دیں
 گی بھلا، ہے نہ۔“

”اور کیا چودھری ہاؤس سے زیادہ ورائٹی انہیں
 کہاں ملے گی۔“

اب تک خاموش بیٹھی کشف چودھری نے مونے
 شیشوں کی عینک اور موٹی جلد والی بڑی سی جنتی یک
 ایک طرف رکھتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے
 رخ سے سج نے بیٹا کو تمہلا کے رکھ دیا۔ مجھے البتہ برا مزہ
 آیا۔

”ہاں یار۔ واقعی۔! وہ تو مشکل میں پڑ جائیں گی
 لڑکے دو اور لڑکیاں تھوک کے بھانے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ مجھے
 خواہ مخواہ ہنسی آئے جاری تھی۔ ”چودھری ہاؤس سے
 باہر نکلنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ چہ چہ۔ بے
 چاری جینم پھوپھو۔ کھن چکر بن کے رہ جائیں گی،
 ایک سے ایک بڑھیا مال۔ عمدہ کوانٹی۔“

”سٹاپ لٹ۔“ میری توقع کے عین مطابق بیٹا چیخ
 پڑی۔

”پلیز، خود کو یوں ڈی گریٹ مت کیا کرو۔ جب
 تک تم لوگ خود اپنی عزت نہیں کرو گی، دوسروں سے
 کیا خاک کرو پاؤ گی۔“

”ہاں اور تم جو بیسوں سمیٹے اپنی عزت خود ہی کرتی
 رہتی ہو اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ تمہاری دیکھا دیکھی بھی

کسی دوسرے نے تمہاری عزت کی؟۔“ گل بین
 عرف بیٹا نے فضول سا جملہ مارا۔

گل بیٹا نے آسف سے ایک نظر خود سے ڈیڑھ
 سال بڑی گل بین پر ڈالی، پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔
 ”سحاب! کم از کم تم سے مجھے یہ توقع نہیں تھی۔

اپنی ہی صنف کے لیے ایسے ایسے ہنگ آمیز بھرنے
 لڑکیاں ہیں یا پرچوں کی چیزیں جو تھوک کے بھانے
 گنوار ہی تھیں تم اور۔ اور۔ توبہ بڑھیا مال، عمدہ

کوانٹی You should shame yourself

چودھری ہاؤس کی لڑکیاں شوکیس میں بھی ڈیکوریشن کی
 چیزیں نہیں جو کوئی اپنی مرضی سے اٹھا اٹھا کر کوانٹی

جانچے گا۔ یہ تو طے ہے کہ جینم پھوپھو کو اپنے

صاحبزادوں کے حوالے سے اس گھر سے تو کوئی وی آئی

پی پروٹوکول نہیں ملنے والا۔“

”ہاں ہاں، تم نے طے کر لیا اور سمجھو طے ہو گیا۔“

بیٹا نے مونگ پھلی پہ ڈھیر سا چاٹ مسالا چھڑکتے
 ہوئے تمسخر اڑایا۔

”بیٹا بی بی! تمہاری فلاسفی اپنی جگہ لیکن ماؤں کی

فلاسفی اور وہ بھی قابل فکر تعدد میں پائی جانے والی

بیٹیوں کی ماؤں کی فلاسفی۔ کچھ اور ہے۔ ذرا اور نیچے

کے پور سنسر میں ایک نظر دو ڈالو پھر نعرے لگانا تعظیم

نسواں اور حقوق نسواں کے امی، رابعہ آئی اور

نفیسلہ آئی تینوں کا جوش و خروش اور پھوپھو کے

استقبال کی تیاریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کچن

میں ڈیڑھ مہینے کا مینو ترتیب دے کر لٹکایا جا چکا ہے۔

گیسٹ روم میں گھر کے فرنیچر میں سے تمام اچھے اچھے

آئینے منقل ہو چکے ہیں۔ بڑے چاچو کو نئے سروں اور

کارپٹ کے لیے آرڈر دیا جا چکا ہے ایک کل وقتی

ڈرائیور رکھنے کا معاملہ زیر غور ہے، جو کہ پھوپھو اور ان

کے بیٹوں کی خدمت میں پیش کیا جاسکے۔ آف

کورس، بسہ، ایک شاندار گاڑی کے اور ہماری تمہاری

مائیں اپنے اپنے اسٹور رو میں بڑی لمبی چوڑی بیٹریوں

میں سرگھسائے نبھانے کب کے سنبھالے مسکے

پریشانیوں سے اتنی چڑھتی۔ اس کے لہجے کی بیزاری کو میں نے شگفتگی سے ڈھانپنا چاہا۔

”چوہدری ہاؤس کی تمام لڑکیوں نے سب سے زیادہ تنگ بھی تو انہی کو کیا ہے۔ یہ سب لڑکیاں ان ہی کے سلع فراک پس کر، ان ہی کے پکائے پرانے کھا کر اسکول جاتی رہی ہیں۔ ان ہی کے ہاتھوں تیل پی پی کر یہ بال اتنے لمبے ہوئے ہیں اور ان ہی کے بنائے حلوے اور مربے کھا کھا کر یہ دلغ اتنے چل پڑے ہیں کہ کشف بی بی ہیومن سائیکالوجی میں ایم فل کر رہی ہیں اور شاداب بی بی انگلش لٹریچر میں ماسٹرز۔“

جس طرح شاداب، میری بڑی، بسن کو بات بے بات بڑی امی کی شکایت جڑنے کی عادت تھی اسی طرح اس کی ہر شکایت پر جو امی کارروائی کے طور پر بڑی امی کی ان گنت مہربانیوں میں سے چند ایک کو جتنا میرا طریقہ بن چکا تھا۔ اب بھی شاداب نے بھنویں اچکا کر مجھے یوں گھورا جیسے کہہ رہی ہو، ”تم باز نہ آنا، چچی۔ اور پھر سے مووی کی طرف متوجہ ہو گئی۔“

سوٹ پس چھانٹ رہی ہیں۔“ ہم سب میں وہی زیادہ بڑوں میں ٹھہری رہتی تھی اور پھر اکلوتی منگنی شدہ ہونے کی وجہ سے اسے خاص رعایت بھی حاصل تھی۔ جس کی رو سے عموماً چھوٹے موٹے معاملات میں بڑی امی اور آٹیاں اسے رازدار بنا لیا کرتیں۔ ویسے سچی بات تو یہ تھی کہ خود اسے بھی بڑی لادوں کی طرح ہر بات میں ٹھہنے کا شوق زیادہ تھا ورنہ کیلی آبی اور شاداب اس سے عمر میں بڑی تھیں۔ لیکن ہر طرح کے معاملے سے الگ تھلگ رہتیں اور میں اور رحمت بھی اس سے بس چند مینی ہی چھوٹی تھیں لیکن ذہنی لحاظ سے شاید وہ ہم دونوں سے کئی سال زیادہ ”گھریلو“ تھیں۔

بیڈا نے اس کی اس نئی اطلاع کو ناپسندیدگی سے سنا۔ ”تم سب کان کھول کر سن لو۔ یہاں کوئی افسانوی جوتیشن نہیں دہرائی جائے گی۔ یہ جینم پھوپھو کوئی ہماری سکی پھوپھو تو نہیں ہیں اس لیے زیادہ آگے پیچھے پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ان کے سپوتوں کو تو ہر گز منہ نہیں لگاتا۔ خبردار جو کسی نے اپنا اخلاق بگھارنے، گھڑایا اور سلیقہ شعاری جتانے یا حسن نکھارنے کی کوشش کی۔“ اس کے رعب جھانے پر رحمت ماتنڈ کر گئی۔

”ہونہ، ہمیں کیا ضرورت ہے ایسے تھکنڈوں کی، لیکن ڈرڈھ مہینے تک گھر آئے مہمانوں سے یوں الگ تھلگ بھی تو نہیں رہا جاسکتا۔“

”اور پھر بڑی امی۔ وہ ایسا کرنے دیں گی نا ممکن۔۔۔ اب اور میں کیا کہوں تمہاری امی کو تم زیادہ بہتر جانتی ہو گی، ان کا بس نہیں چلتا چوہدری ہاؤس کی تمام لڑکیوں کو راتوں رات ٹھکانے لگا دیں۔“

شاداب جو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی اشار موویز پر اپنے فیورٹ ٹام ہینکس کو Cast away میں آگ جلانے کی کوشش میں سرگرداں دیکھ رہی تھی بڑی امی کا نام لینے سے خود کو روک نہ سکی۔ اسے نجانے کیوں بڑی امی اور ان کی ہدایتوں، فکروں،

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

- * دل نہووں کی بستی — بحبت مد اللہ — 400/-
- * جہ پلے تو بہاں تے گزرتے — ساہا ملک — 150/-
- * وہ خنجر سی دیوانی سن — شب سیرت — 400/-
- * طے اثر ہوتی — رفعت سراج — 550/-
- * دیوان امید اور محبت — عبیدہ احمد — 180/-
- * خواتین کا گھریلو انسائیکلو پیڈیا — 600/-

خواب و سرور، آفت پیپر، خوبصورت چھپائی وید زب منظر اجار

شائع ہو گئے ہیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار

- * لاہور، کدھی، سلطان نیوز ایجنسی
- * عظیم آباد، سنز، اسلامیہ کتب خانہ

مہران نیوز ایجنسی اشرف بک ایجنسی

”اور ہاں وہ چھوٹیاں کہاں ہیں، بلاؤ ذرا ان تینوں کو۔“ بیلا کو ایک کیٹی، مٹی اور سیما کی فکر لگ گئی۔
 ”اب انہیں کیا مٹی پر بھائی ہے، خدا کا واسطہ ہے بچیوں کو تو بخش دو۔ تمہارا اپنا دماغ تو خراب ہو چکا ہے کیوں ان معصوموں کو بھی اب نارمل بنانے پر تلی بیٹھی ہو۔“

بیلا سے اس طرح کی بات صرف مینا ہی کر سکتی تھی، وہ واضح طور پر اپنا بڑی بہن والا امیج کیش کر لیتی تھی۔ یوں تو بیلا نے چھوٹی بہنوں پر جو لیڈر شپ بنارہی تھی، وہ ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہ تھی لیکن سوائے مینا کے اور کوئی کھلم کھلا اس پر تنقید کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا حتیٰ کہ میں بھی نہیں جسے تمام کزنز میں بیلا سے قریب تر ہونے کا دعویٰ تھا۔

”ہاں نارمل تو بس تم ہی ہو۔“ وہ جواباً بڑبڑاتی اور کمرے سے نکل گئی۔

”چلو اب جا کر دماغ کھائے گی ان تینوں کا۔ بھلا ان بیچاروں کا اس قصے سے کیا تعلق۔“ شبنم پھوپھو کے دو ہی تو بیٹے ہیں، ان دونوں کے آج گروپ کے لحاظ سے صاحب شاداب، گل بیلا، رحمہ اور کشف ہی میں سے سلیکٹ کریں گی وہ اپنی بسوئیں۔ ان چھوٹیوں کو لیکچر دینے کا کیا فائدہ۔“

”اف۔ ف۔ ف۔ مینا! شاداب نے جیسا کافی لمبا کھیچتے ہوئے وہائی دی۔“ ابنا نارمل تم دونوں بہنیں ہی ہو۔ ایک وہ ہے شادی بیاہ اور رشتوں کے ٹاپک سے حد درجہ الرجک اور ایک تم ہو جسے دنیا میں اور کوئی موضوع ہی نہیں ملتا سوائے رشتہ لانے والی مائیوں کی طرح لڑکیوں کی بڑھتی عمروں اور رشتوں کی عدم دستیابی پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے۔ پلیز ذرا امی اور آئیوں کے ساتھ کم اٹھا بیٹھا کرو۔“

اب کے شاداب نے اپنے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھایا اور گل بین کو لتاڑ کر رکھ دیا، وہ برے برے منہ بناتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”توبہ ہے، آؤ صاحب! ہم ٹیرس پہ چلتے ہیں۔“ اس نے رحمہ کو اسکیچ بناتے، کشف کو اسٹڈی کرتے اور

شاداب کو لڑنے پہ آمادہ دیکھتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ نکلنے پر اکسایا۔ اپنے بچاؤ کے لیے میں نے قریب پڑا نیوز پیپر اٹھالیا۔

”تم چلو، میں بس ابھی آئی۔“ اس کے نکلنے ہی میں نے سکون بھری سانس لی۔

رحمہ نے سر اٹھا کر مجھے مسکرا کر دیکھا، میں بھی جھینپ کر مسکرا دی۔ مینا کو خالصتاً ”عورتوں والے“ سنجیدہ گھریلو مسئلوں میں الجھنے کا خط تھا، کوئی بھی تازہ ترین واقعہ اسے کئی دن تک بحث چھیڑنے کا موقع فراہم کر جاتا اور میں جانتی تھی کہ اگلے دو چار روز میں شبنم پھوپھو کے آنے سے پہلے پہلے ہی وہ ان کے دونوں بیٹوں کے لیے ہم میں سے دو کو خود ہی فاسٹل کر لے گی اور پھر پھوپھو کے دل میں جگہ بنانے کے لیے بیش بہا مشوروں سے بھی نوازے گی۔ جب سے اس کی مٹنی ہوئی تھی تب سے وہ بھی بڑی امی، آئی راجہ اور آئی فیصلہ کی طرح ”بکریوں“ کی فکر میں ہلکان رہنے لگی تھی۔ اس کی اس عادت سے ہم سب تو بے زار تھے ہی بیلا سب سے زیادہ تپتی تھی۔

اس وقت بھی اس کی بور کرنے والی گفتگو سے بچتے ہوئے میں نے نیوز پیپر کے اسپورٹس اسپیشل کے پیچھے پناہ لی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے بے سوریہ کے نسواری چہرے پہ بچی، جامنی ہونٹوں سے جھانکتی، دودھ جیسے سفید دانتوں کی قطار کو منہ بناتے ہوئے دیکھا اور پیرتہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

”یار! کوئی نیوز تو سناؤ۔“ کشف نے اپنی کنگ سائز کتاب کے پیچھے سے فرمائش داغی۔

”تم خود کبھی اخبار پڑھنے کی زحمت نہ کرنا۔“ اس کی سہل پسندی کو لتاڑتے ہوئے میں نے نیچے لاؤنج میں جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ لیلیٰ آپی آج خلاف معمول گھر پہ تھیں۔

”آپی! آپ ہا سٹل نہیں گئیں۔“ میری آواز پہ وہ ایک دم چونک گئیں۔ ہاتھ میں پکڑے کفن اچھل کر نیچے جا گرے۔ خالی خالی نظروں سے وہ مجھے دیکھنے لگیں۔ میں سمجھ گئی کہ حسبِ عادت وہ ایک

جائے گا۔

”تم سے تو اللہ ہی غمٹے گا جلیبی۔ وہ بھی جلی ہوئی۔“

”اچھا یہ بتاؤ، کیسی گزر رہی ہے، لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے۔“

”تمہارے بغیر خاصا پر سکون ماحول ہے۔“ اس نے مسلسل میرا دل جتانے کی کوشش جاری رکھی لیکن میں ڈھیٹ بنی رہی۔ جانتی تھی اس وقت ہر منٹ گزرنے پر اس کا خون خشک ہو رہا ہو گا بل بڑھنے کے خوف سے، میں نے اس کی جزبز ہوتی شکل کا تصور کرتے ہوئے مزہ لیا۔

”ہاں لڈو پیڑے! ایک ضروری بات پوچھنی تھی، کب سے پوچھنا چاہ رہی تھی مگر موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ آج یاد آئی تو سوچا تم سے پوچھ لوں۔ دیکھو سچ سچ بتانا۔“

”ہاں ہاں۔ کیا بات ہے؟“ میری توقع کے عین مطابق وہ تجسس ہو گیا۔ میں نے بھی لہجے میں حد درجہ سنجیدگی بھرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

”سنو یہ جو تمہارے میس کا دھوپی ہے، کیا وہ بھی تمہارے موزے دھوتے ہوئے پافا طماں کی طرح الٹیاں کرتا ہے۔؟“

جملہ مکمل کرتے کرتے میری خود ساختہ سنجیدگی فوت ہو گئی اور تہقہ اہل پڑا۔ دوسری طرف مکمل خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت بے بسی کی انتہا پہ کھڑا دانت پیس رہا ہو گا۔ لی سی او سے فون کرنے کی وجہ سے کال ڈس کنیکٹ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پھر دوبارہ نجانے کب باری آئے اور یہی وقت ہوتا تھا اسے جی بھر کے تنگ کرنے کا۔ لیلیٰ آپنی کی سرزنش کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں نے اپنا حنفل جاری رکھا۔

”چہ چہ، بری بات۔۔ اچھے بچے ایسے نہیں کرتے، میں جانتی ہوں اس وقت تم اپنے وسیع و عریض چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میرے بارے میں کوئی ناشائستہ

معمول کی طرح کورکشن پہ چڑھانے کا کام انجام دے رہی تھیں اور دماغ ان کا اس وقت کسی اور جہان کی سیر کر رہا تھا، میری آواز انہیں سیدھا منظر میں گھسیٹ لائی تھی۔ اس بے سوال دہرایا۔

”میری ٹائٹ ڈیوٹی ہے۔“

”تو پھر جا کر آپ آرام کیجئے، یہ کن کاموں میں لگی ہیں، ساری رات جاگتا ہے تو جا کر چند گھنٹے سو لیں۔“ میں نے ان کے ہاتھ سے باقی کے کٹن لے لیے۔

”باگل۔۔!“ وہ سر جھٹک کے مسکرائیں، ”یہ کوئی سونے کا وقت ہے اور بھلا نیند بھی ایسے آتی ہے کہ جب چاہا مین آف کیا سو گئے، مین آن کیا نیند پوری ہو گئی۔“

”آپ کا تو پتا نہیں، میری نیند بس ایسی ہی ہے، سونے کا ارادہ کرتی ہوں اور آنکھیں بند۔“ فون کی بیل پہ میں آفٹو اوہوری چھوڑ کر کارٹر پہ رکھے بلی فون سیٹ کی جانب لپکی۔ آج ویک اینڈ تھا اور یہ وقت عطا کے فون کرنے کا تھا۔ دوسری طرف واقعی وہ تھا۔

”سحاب۔۔! مجھے پتا تھا تم ہی ہو گی اوبائی گاڈ۔۔ ایک گھنٹہ تو کہیں نہیں گیا۔ کاش تم جان سکتیں یہ لائنگ ڈسٹنس کال اس وقت مجھے کتنی بھاری محسوس ہوتی ہے، جب دوسری طرف تم میرے متھے لگتی ہو۔“ میری ہیلو کے جواب میں اس نے دہائی دی۔

”نہ دعا، نہ سلام۔ رسالہ پور کی فیسری روٹیوں میں ایسا کون سا نمک ڈالتا ہے جس نے تمہارے دیدے ہوائی کر دیے ہیں۔ یہ ساری بے مروتی، بد لحاظی، زندہ دلاں شر لاہور سے نکلنے کا نتیجہ ہے۔“

”سلام بھی کر لیتے ہیں جناب اور دعا بھی دے لیتے ہیں، جائیے لی بی سحاب رحمت اللہ چودھری، خدا آپ کے شر سے اہل خاندان کو محفوظ رکھے۔ اچھا اب ممی اور بڑی امی سے بات کرو اور میری پاپا گھر پہ ہیں کیا؟“

”ہیلے مجھ سے تو نمٹ لو پیڑے۔“ سامنے بیٹھی مسکراتی لیلیٰ آپنی کو بھی میں نے اشارے سے منع کر دیا کہ ابھی وہ کسی کو عطا کے فون کا نہ بتائیں، میں جانتی تھی اس سے بات کرنے کے لیے ابھی گھر بھرا کٹھا ہو

کلمات کہہ رہے ہو گے۔

”سحاب! میں آخری بار کہہ رہا ہوں میری جان چھوڑو ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔“

”چھا کیا کر لو گے تم؟“

”میں اسی ہفتے لاہور آ رہا ہوں پھر آکر بتاؤں گا۔“

اس نے دھمکی دی میں خوفزدہ ہونے کے بجائے خوشی سے چلا اٹھی۔

”جی پیڑے! تم آ رہے ہو؟ زیادہ دنوں کے لیے“

قریب سے دھیلے دھیلے قدموں سے گزرتی چودھری عطا اللہ کی چھوٹی بسن کائنات عرف کشمی کے کان کھڑے ہوئے پیڑے کا لفظ سن کر۔

”عطی بھیا۔ عطی بھیا کا فون۔“ اس کی ساری سستی ہوا ہو گئی اور پھر کی کی طرح گھر میں گھوم کر اس نے خبر نشردی۔ کمروں کے دروازے کھلنے لگے۔

بڑے ابو بڑی امی دوپہر کو سونے کے عادی تھے سو آنکھیں ملنے باہر نکلے۔ بڑے پاپی یعنی عطا کے والد جگے پیرا شنڈی سے بھاگے آئے راجہ کی شاہی کوئی دلیفہ پڑھ رہی تھیں۔ اسی طرح چار پاپی مسیح تھامے بیٹے کے فون کی خبر سن کر چلی آئیں۔ چاچہ سے بھی کیہل کے آگے سے اٹھنا گوارا کر لیا اور فیصلہ آگنی کی انگلیوں میں دبا بین بتا رہا تھا کہ وہ فون سننا ہے بتاتے اٹھ کے باہر آئی ہیں۔ بیٹا جو کچھ وہ فون منہ پھلائے پھر رہی تھی اب پچھیں چہرے بڑے ابو کو فون پہ باتیں کرنا دیکھ رہی تھی جیسے ساری کشتیوں اس کی سمجھ میں آ رہی ہو۔ مجھے اسے دیکھ کر ہنسی آگئی۔ کشف بھی کتاب سمیت بات کرنے کے خواہش مندوں میں قطار بنائے موجود تھی البتہ بڑے ابو کے بجائے موئے چشموں کے پیچھے سے اس کی ذہین آنکھیں کتاب پہ ہی مرکوز تھیں۔ رحمہ کے چہرے پر ماسک لگا تھا اور شاداب ریسپور کو بڑے غور سے ابو سے بڑی امی تک منتقل ہوتے دیکھ کر بڑبڑا رہی تھی۔

”لو اب بھلا بڑی امی آسانی سے ریسپور کا پیچھا چھوڑیں گی؟ وہ تو پوری رپورٹ لیں گی کہ عطا نے پشتو

کے اور کون سے کون سے لفظ سیکھے ہیں چار سہ کے چلی کباب کھائے یا نہیں۔“ اور اس کے پیچھے لائن بنا کے کھڑی ”چھوٹیاں“ کیتی، حمنی اور سیمہ۔ بظاہر بڑے صبر سے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔

”کتنا خوش نصیب ہے یہ عطا بھی۔ ماشاء اللہ۔“ اسے اتنے لوگوں کی محبتیں سمیٹتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ رشک سا آیا پھر داؤ کی گھوریاں تصور میں آتے ہی میں نے گڑبڑا کر ماشاء اللہ کہا۔ جب داؤ زندہ تھیں تو ہم سب ہی کزنز عطا سے خار کھایا کرتیں۔ داؤ، داوا کی ساری شفقتیں، عنایتیں اس پہ پچھاؤرتے دیکھ کر جل جل کر جل کر جل کر بن جایا کرتیں اور ہمارے ہلکے سے کسی حاسدانہ جملے پہ وہ غضب ناک ہو کر گھورتیں۔

”اے شیریں! یہ ان لڑکیوں کو یہاں سے لے جا۔ کم بخت ماریاں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے شہزادے کو کھانا دیکھ گھور رہی ہیں حالانکہ پہلے میں نے انہیں ایک ایک کیلا پکڑایا پھر عطا اللہ کو کھلانے بیٹھی ہو مگر یہ جو ”بکریاں“ ہیں نا منٹوں میں سب چر کر اس پہ نظر لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

اور بڑی امی سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر مجھے، بیلا، بیٹا، شاداب اور رحمہ کو گھسیٹ لے جائیں اور تب ہی کسی دن بڑے غصے سے عطا کے پھولے پھولے گالوں والے گول چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے ”لڈو پیڑے“ کا خطاب دیا تھا۔

میری چونکہ اس سے اچھی خاصی بات ہو چکی تھی لہذا اپنے اور شاداب کے مشترکہ کمرے کا رخ کیا۔ جہاں ہمیشہ کی طرح بیلا پہلے سے موجود تھی اگرچہ اس کا اور بیٹا کا کمرہ ایک تھا لیکن چونکہ دونوں کی چونچیں اکثر لڑتی رہتیں اس لیے وہ تب اپنے کمرے کا رخ کرتی جب بیٹا کے سونے کا ایک یقین ہو جاتا۔ مجھ سے اس کی خوب بنتی شاید اس لیے کہ مجھے کرید کرید کر سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ اب بھی میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ سارے گھر کی طرح عطا سے بات کرنے کی خواہاں کیوں نہیں۔ اسے میری یہی عادت

”اے شیریں! یہ ان لڑکیوں کو یہاں سے لے جا۔ کم بخت ماریاں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے شہزادے کو کھانا دیکھ گھور رہی ہیں حالانکہ پہلے میں نے انہیں ایک ایک کیلا پکڑایا پھر عطا اللہ کو کھلانے بیٹھی ہو مگر یہ جو ”بکریاں“ ہیں نا منٹوں میں سب چر کر اس پہ نظر لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

اور بڑی امی سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر مجھے، بیلا، بیٹا، شاداب اور رحمہ کو گھسیٹ لے جائیں اور تب ہی کسی دن بڑے غصے سے عطا کے پھولے پھولے گالوں والے گول چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے ”لڈو پیڑے“ کا خطاب دیا تھا۔

میری چونکہ اس سے اچھی خاصی بات ہو چکی تھی لہذا اپنے اور شاداب کے مشترکہ کمرے کا رخ کیا۔ جہاں ہمیشہ کی طرح بیلا پہلے سے موجود تھی اگرچہ اس کا اور بیٹا کا کمرہ ایک تھا لیکن چونکہ دونوں کی چونچیں اکثر لڑتی رہتیں اس لیے وہ تب اپنے کمرے کا رخ کرتی جب بیٹا کے سونے کا ایک یقین ہو جاتا۔ مجھ سے اس کی خوب بنتی شاید اس لیے کہ مجھے کرید کرید کر سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ اب بھی میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ سارے گھر کی طرح عطا سے بات کرنے کی خواہاں کیوں نہیں۔ اسے میری یہی عادت

”اے شیریں! یہ ان لڑکیوں کو یہاں سے لے جا۔ کم بخت ماریاں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے شہزادے کو کھانا دیکھ گھور رہی ہیں حالانکہ پہلے میں نے انہیں ایک ایک کیلا پکڑایا پھر عطا اللہ کو کھلانے بیٹھی ہو مگر یہ جو ”بکریاں“ ہیں نا منٹوں میں سب چر کر اس پہ نظر لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

اور بڑی امی سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر مجھے، بیلا، بیٹا، شاداب اور رحمہ کو گھسیٹ لے جائیں اور تب ہی کسی دن بڑے غصے سے عطا کے پھولے پھولے گالوں والے گول چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے ”لڈو پیڑے“ کا خطاب دیا تھا۔

میری چونکہ اس سے اچھی خاصی بات ہو چکی تھی لہذا اپنے اور شاداب کے مشترکہ کمرے کا رخ کیا۔ جہاں ہمیشہ کی طرح بیلا پہلے سے موجود تھی اگرچہ اس کا اور بیٹا کا کمرہ ایک تھا لیکن چونکہ دونوں کی چونچیں اکثر لڑتی رہتیں اس لیے وہ تب اپنے کمرے کا رخ کرتی جب بیٹا کے سونے کا ایک یقین ہو جاتا۔ مجھ سے اس کی خوب بنتی شاید اس لیے کہ مجھے کرید کرید کر سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ اب بھی میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ سارے گھر کی طرح عطا سے بات کرنے کی خواہاں کیوں نہیں۔ اسے میری یہی عادت

”اے شیریں! یہ ان لڑکیوں کو یہاں سے لے جا۔ کم بخت ماریاں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے شہزادے کو کھانا دیکھ گھور رہی ہیں حالانکہ پہلے میں نے انہیں ایک ایک کیلا پکڑایا پھر عطا اللہ کو کھلانے بیٹھی ہو مگر یہ جو ”بکریاں“ ہیں نا منٹوں میں سب چر کر اس پہ نظر لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

اور بڑی امی سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر مجھے، بیلا، بیٹا، شاداب اور رحمہ کو گھسیٹ لے جائیں اور تب ہی کسی دن بڑے غصے سے عطا کے پھولے پھولے گالوں والے گول چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے ”لڈو پیڑے“ کا خطاب دیا تھا۔

میری چونکہ اس سے اچھی خاصی بات ہو چکی تھی لہذا اپنے اور شاداب کے مشترکہ کمرے کا رخ کیا۔ جہاں ہمیشہ کی طرح بیلا پہلے سے موجود تھی اگرچہ اس کا اور بیٹا کا کمرہ ایک تھا لیکن چونکہ دونوں کی چونچیں اکثر لڑتی رہتیں اس لیے وہ تب اپنے کمرے کا رخ کرتی جب بیٹا کے سونے کا ایک یقین ہو جاتا۔ مجھ سے اس کی خوب بنتی شاید اس لیے کہ مجھے کرید کرید کر سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ اب بھی میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ سارے گھر کی طرح عطا سے بات کرنے کی خواہاں کیوں نہیں۔ اسے میری یہی عادت

”اے شیریں! یہ ان لڑکیوں کو یہاں سے لے جا۔ کم بخت ماریاں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے شہزادے کو کھانا دیکھ گھور رہی ہیں حالانکہ پہلے میں نے انہیں ایک ایک کیلا پکڑایا پھر عطا اللہ کو کھلانے بیٹھی ہو مگر یہ جو ”بکریاں“ ہیں نا منٹوں میں سب چر کر اس پہ نظر لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

پسند تھی کہ میں بلاوجہ کسی بھی عمل کی وجہ دریافت کرنے کھڑی نہیں ہو جاتی حالانکہ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میرے سوال نہ کرنے کی وجہ میری بے نیازی نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کبھی کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہی نہیں مجھے خود ہی سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔ جی ہاں میری ذہنیوں ڈھیر خصوصیات میں یہ سرفہرست خصوصیت ہے میری قیافہ شناسی جو غضب کی ہے۔

”بیلا! عطا آ رہا ہے ڈھیر سارے دنوں کے لیے۔“

”یوں کمبو ڈھیر سارے کوفت بھرے دنوں کے لیے۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ اسی وقت لیلی آلی اندر آئیں۔

”تم دونوں فارغ ہو تو جا کر ذرا گیٹ رومز کی ڈسٹنگ وغیرہ کرو۔“

”کر دیں گے آلی! بلکہ جس وقت شہنم پھوپھو نے آنا ہو گا اس سے آدھا ٹھنڈے پیلے کریں گے ابھی کرنے کا کیا فائدہ پھر سے گرد جمع ہو جائے گی۔“ بیلا نے بیزاری سے کہا۔ وہ کام چور تھی نہ سیل پسند بلکہ ہم سب میں زیادہ ذمہ دار۔ لیکن ان متوقع مہمانوں سے نجانے کیوں بے رحم کھائے بیٹھی تھی۔

”وہ لوگ کل صبح کی فلاسٹ سے آرہے ہیں۔ پہلے کچھ پھونے اپنے سسرال جانا تھا اور ایک ہفتے کے بعد اوھر آنا تھا لیکن اب پتا چلا ہے کہ ان کی ساس اپنے بڑے بیٹے کی فیملی کے ساتھ عمرے پہ گئی ہیں اس لیے وہ سیدھا ہمیں آئیں گی۔“ میں نے اسے اطلاع دی تو وہ منہ کر چپ ہو گئی۔



میری زندگی کا تیسرا سال ختم ہو کر چوتھا شروع ہو رہا تھا جب بیلا کی انگلی تھامے میں ”چودھری ہاؤس“ میں داخل ہوئی اور اس منظر سے میرے حافضے کی کتاب کا پہلا ورق کھلتا ہے۔ میرے ساتھ مجھ سے بڑی بہن شاداب اور بیلا کی گود میں مجھ سے چھوٹی سیماب تھی۔ میں بڑی بڑی آنکھیں کھولے بیلا کو داد کی گود میں

سر رکھ کر تو کبھی دادا کے کاندھے سے لگ کر روتے دیکھ رہی تھی۔ بالکل بیلا ہی کے جیسے دکھنے والے ایک انکل جن سے بڑے ابو کہہ کر تعارف کرایا گیا تھا، بار بار بیلا کو چپ کراتے ہوئے دادو کو بھی مزید بولنے اور گلے شکوے کرنے سے باز رکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک خوب گوری چچی صحت مند سی عورت کی گود میں میری دو ماہ کی بہن سیماب ایک طرف گردن ڈالے سو رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی، سیماکتے دنوں سے بیلا کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ روتی تو چپ ہی نہ ہوتی اور سونا تو جیسے اسے آتا ہی نہ تھا۔

شاداب ایک طرف لائن بنا کر کھڑی تین بچیوں کی طرف متوجہ تھی۔ ایک میم آگے آئی شاداب کا ہاتھ پکڑ کر اس کا تعارف ان بچیوں سے کرایا لگی۔ ان بچیوں میں تیسری جو سب سے چھوٹی تھی، شاید بالکل میری ہی عمر کی، وہ ہو سو اس میم کی کاپی تھی۔ وہی ہی گوری گلابی رنگت، کھڑے نقوش، نیلی کانچ سی آنکھیں اور ہلکے سنہرے بال جو وہ بھی منی پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے۔ ایسی ہی ایک سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا اس میم کی گود میں بھی تھی جس کے منے سے لب بے حد سرخ تھے۔ میں دلچسپی سے اس میم اور انگریز گڑیوں کو دیکھنے لگی۔ صینک والے انکل نے، جن سے بیلا نے بڑے بیلا کہہ کر تعارف کرایا تھا، میرا ہاتھ تھام کر اپنے پاس کھینچا اور آواز دی۔

”کشف!“

وہی انگریز گڑیا بھاگ کے آئی اور بڑے بیلا نے مجھے اس کے ساتھ کھیلنے بھیج دیا۔ بڑے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے چائے کی ٹرائی اندر لاتے ہوئے ایک اور نازک سی دلہن جیسی آنٹی کو دیکھا، دلہن اس لیے کہ وہاں موجود تمام آنٹیوں میں اس نے میک اپ بھی کیا ہوا تھا، کانوں میں لٹکتے بندوں کے ساتھ ساتھ گلے میں لاکٹ اور موٹی سی چین بھی موجود تھی۔ انگلیوں میں کئی ایک رنگز اور کلائی میں سونے اور کانچ کی چوڑیاں بھی تھیں جبکہ وہ میم آنٹی ان کے گلے میں بس اللہ والا لاکٹ اور دوسری والی کی ایک کلائی میں عجیب

موٹا سا کنگن پھنسا ہوا تھا۔ یہ تھا میرا پہلا تعارف چودھری ہاؤس کے مکینوں سے۔ جلد ہی میں نہ صرف ان سب سے واقف ہو گئی بلکہ خود سے بھی۔ ہاں دادو کی بدولت وقت سے بہت پہلے ہی مجھے وہ باتیں بھی معلوم ہو گئیں جو شاید پاپا مجھ سے ابھی چھپانا چاہتے تھے۔

بڑے چودھری صاحب یعنی میرے دادا گاؤں سے شہر اٹھ کر آئے تھے۔ اس لیے گھر میں روایتی نظام اور خاندانی رکھ رکھاؤ واضح طور پر نمایاں تھا لیکن پوش علاقے میں رہائش رکھنے، مالی حیثیت اچھی ہونے اور پھر سب سے بڑھ کر اولاد کو اچھے اداروں میں پڑھانے کی وجہ سے بہت جلد پینڈوپن کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ ان کی بیٹی کوئی نہ تھی، چار بیٹے تھے، چھوٹے بھائی کی بیٹی کو لگاؤ کی وجہ سے اپنے ساتھ شہر لے آئے تھے، بڑھا لکھا کر خود ایک اچھے تعلیم یافتہ گھرانے میں شادی کی۔ یہی شبنم چھو پھو تھیں جو شادی کے چند سال بعد ہی اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ افریقہ چلی گئیں۔

دادو اچھے رعب داب والی خاتون تھیں، عین دوا کے آگے ان کا بس نہ چھتا تھا۔ دوا کو اپنی سن جانی کا شوق تھا۔ بڑے بیٹے بدایت اللہ کی شادی خود ہی کیسے طے کر آئے اور گھر اگر اظہار دی۔ دادو بیٹے کے لیے چاند سی دلہن ڈھونڈنے کا خواب نو تار کیج کر سچا گئیں۔ روانے اپنے کسی دوست کی بیٹی سے رشتہ جوڑا تھا جو افغانی نژاد، قالینوں کا تاجر تھا اور چند سال قبل ہی قندھار سے ڈیرہ اسماعیل خان آکر رہائش پذیر ہوا تھا۔ دلہن آئی چاند سی ضرور تھی مگر بیٹے سے چند سال بڑی اور سسرال کی زبان پنجابی سے تابلہ ہونے کے علاوہ اردو بھی ٹوٹی پھوٹی بولتی تھی۔ دادو فارسی اور پشتو بولنے والی اس لمبی ترنگی گنوار اطوار والی بہو سے ذرا خوش نہ ہوئیں۔ یوں بڑی امی یعنی شیریں بی بی چودھری ہاؤس کی پہلی اور بڑی بہو ہونے کے ساتھ ساتھ ناپسندیدہ بہو بھی کہلا گئیں۔

دادو نے دوا کے خلاف اسینڈ لیا اور انہیں مزید کسی بیٹے کے سلسلے میں کوئی اختیار دینے سے صاف انکار کر

دیا۔ دوسرے بیٹے نعمت اللہ چودھری یعنی بڑے پاپا نیوی میں تھے، اب دادو نے ان پر زور دینا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ برادری میں لڑکیاں دیکھنا بھی جاری رکھا لیکن بڑے پاپا ان کی ہر منتخب کردہ لڑکی کو مسترد کر دیتے۔ ایسے میں بڑے ابو کے ہاں گل بیٹی، گل رخ کا اضافہ ہو گیا اب دادو کے دل میں پوتے کے ارمان بھی مچلنے لگے، ان کے بڑھتے دباؤ سے تنگ آکر بڑے پاپا نے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کرنے پہ تیار نہیں اور خصوصاً برادری میں تو ہرگز نہیں۔

ناچار دادو نے اپنی خالہ زاد بہن کی بیٹی سمیرا کو جو انہیں خاصی بھائی تھیں، اپنے تیسرے بیٹے رحمت اللہ چودھری یعنی میرے پاپا کے لیے مانگ لیا۔ خوب جوش و خروش سے شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں، سارے ارمان نکالے گئے۔ بیچاری شیریں بی بی جو ساس کو خوش کرنے کے لیے پراندہ باندھنا شروع کر چکی تھیں (مینڈویاں چھوڑ کر) برقعہ اوڑھنا شروع کر چکی تھیں (افغانی چادر ترک کر کے) اور پنجابی آمیز اردو بولنے کی پریکٹس بھی کرتی رہتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ ان تین سالوں میں انہوں نے دن رات پنجابی کھانے پکانے کا ساس سر کو کھلائے، آدھی آدھی رات تک ساس کی ٹانگیں دبا لیں۔ ان تمام کاوشوں کے باوجود وہ ساس کی نظر میں معتبر نہ ٹھہر سکیں جبکہ سمیرا یعنی میری مٹی چودھری ہاؤس میں آنے سے پہلے ہی دادو کی پسندیدہ اور چیمپی بہو کی سند پا چکی تھیں کیونکہ وہ پنجابی تھیں، برادری کی تھیں اور سب سے بڑھ کر دادو کا اپنا انتخاب۔

اسی شادی پہ ایک اور دھماکا ہوا اور وہ تھا بڑے پاپا کی اپنی فرج بیوی کے ساتھ اچانک آمد۔ دادو کو اپنی من پسند بہو لانے کا سارا مزہ اڑا کر ہوتا محسوس ہوا۔ بھتا ہو سکتا تھا بیٹے سے ناراضی دکھائی، برا بھلا کہا لیکن ایک تو شادی کا موقع، دوسرے گھر میں مہمانوں کا تانتا اور سب سے بڑھ کر غنی آنے والی میم بہو کی خوب صورتی، بات دو چار دنوں میں دب ہی گئی لیکن دادو نے اتنی جلدی دل صاف نہ کیا۔ بڑے پاپا اپنی نئی نویلی دلہن

امیر مل کے ساتھ اگلے ہی ہفتے واپس چلے گئے۔ یوں بھی ان کی شادی کو چند ہی روز ہوئے تھے اور ان کی من چاہی بیوی کا سوا گت اتنے کھلے دل سے نہ ہوا تھا کہ وہ مزید رکنے کا سوچتے۔

میری مئی کو چودھری ہاؤس میں ایک خاص اسٹیشن حاصل ہوا۔ وہ باقی دونوں ہسپتالوں کے مقابلے میں اپنی اپنی تھیں اس لیے ان کی آؤ بھگت زیادہ ہوئی۔ دادو نے بڑی ہسپتال کے مقابلے میں ان کو واضح اہمیت دینی شروع کی۔ ان کے ناز خڑے کسی شنوادی کی طرح اٹھائے گئے لیکن نجانے کیا بات تھی کہ ان کا دل اس محل نما کو بھی میں نہ لگ سکا۔ اس وقت اتنے لوگ تو نہ رہتے تھے یہاں کہ وہ تنگ بڑتیں لیکن وہ تنگ آگئیں اور بہت جلدی تنگ آگئیں۔ مستزاد یہ کہ انہوں نے دوسروں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ سارا وہ شادی کے چھ ماہ بعد ہی الگ گھر کے لیے زور ڈالتے لگیں۔ سیپا کے لیے ان کی اس فرمائش پر عمل کرنا مشکل تھا وہ نالائے گئے تو مئی دوسرے حربے آزمانے لگیں۔

انہوں نے دادو اور دوا کے اصول و ضوابط کی کھلم کھلا خلاف ورزی شروع کر دی۔ محض ایف اے تک کی تعلیم کے زعم میں نوکری کرنے کا اعلان کر دیا جبکہ ان دنوں وہ امید سے بھی تھیں ظاہر ہے کہ ساس سر نے مخالفت ہی کرنا تھی اور ایسی صورت میں جب ملازمت بھی کوئی قابل احترام نہ تھی۔ کئی کئی دن تک وہ کمرے سے نہ نکلتیں، کھانا اندر منگواتیں، گھر آئے عزیز واقارب کو سلام کیے بغیر آرام سے پاس سے گزر جاتیں۔ بغیر کسی کو بتائے، اجازت لیے کہیں چلی جاتیں، دادو کے سارے لاؤنجرے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اپنے انتخاب کے کرتوتوں پر وہ شوہر اور بیٹے سے منہ چھپائے پھرتیں۔

پھر شاداب کی پیدائش ہوئی، روایت کے مطابق پہلی اولاد نضیال میں ہوئی ہے لیکن شاداب کو پیدا ہوئے سات ماہ گزر گئے اور مئی نے سسرال میں قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔ ان کی ایک ہی ضد تھی۔ الگ گھر۔ ناچار دادو اور دوا کو گھٹنے میٹنے پڑے، انہیں اس فیصلے

تک لانے میں بڑے ابو کا بھی ہاتھ رہا۔ ان کے جانے کے بعد دادو اور دوا کو پھر سے بڑی امی نے ہی سنبھالا۔

ایسے میں بڑے پاپا کی طرف سے یہ خبر ان کے مرہ دلوں میں نئی جان ڈالنے کا سبب بنی کہ وہ ایک بیٹے کے باپ بن چکے ہیں، دوا کی خواہش یہ پہلے پوتے کا نام عطا اللہ رکھا گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے بڑے ابو کی بیٹیوں کے نام رکھنے میں کسی نے دلچسپی نہ لی اور بڑی امی خود ہی اپنے افغانی ٹائپ نام رکھتی گئیں۔ پہلے گل لیلیٰ، پھر گل رخ اور عطا اللہ کے چند ماہ بعد ہونے والی گل بین۔ ماں باپ کی خواہش یہ بڑے پاپا بیٹے اور بیوی کو لے کر پاکستان چلے آئے۔ اپنی فریج بسو کو دیکھ کر دادو اور دوا کو ایک اور خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ امیر مل اب رابعہ نعمت بن چکی تھی۔ انہوں نے اسلام کو محض شوہر کا مذہب جانتے ہوئے نہیں بلکہ دل اور روح کی گہرائیوں سے قبول کیا تھا۔ یہ بات ان کے ہر عمل سے واضح تھی۔

یوں مئی کے جانے کے بعد دادو کی پسندیدہ بسو کا عہدہ رابعہ آئی نے سنبھال لیا۔ یوں بھی اب وہ ایک عدد بیٹے کی ماں تھیں یعنی جو کارنامہ اب تک ان کی دونوں ہسپتالوں نے نہ کیا تھا وہ انہوں نے انجام دیا۔ بعد میں بھی یہ ریکارڈ بدستور قائم رہا یعنی عطا اللہ کے بعد بڑے چودھری صاحب کے کسی بیٹے کو اولاد نہ پہنچے نہیں ہوئی البتہ ان کی زندگی میں بیٹی کی جو گمی رہ گئی تھی وہ ہر سال آنے والی پوتیوں نے پوری کر دی یہاں تک کہ دادو بوکھلا گئیں۔

”آئے ہائے گھر ہے کہ گوال“ (بکریوں کے رہنے کی جگہ۔)

ان کے چھوٹے صاحبزادے چودھری حبیب اللہ یعنی چاچو کے لیے دلہن کا انتخاب بھی بڑے پاپا اور رابعہ آئی نے کیا۔ فاضلہ آئی بڑے پاپا کے ایک پروفیسر کی بہن تھیں۔ دادو کو کوئی اعتراض نہ ہوا، ہوتا بھی کیسے، فاضلہ آئی ہر اعتبار سے پسند کیے جانے کے قابل تھیں۔ خوب صورت، باوقار، اعلیٰ فیملی بیک گراؤنڈ کے ساتھ تعلیم یافتہ بھی تھیں۔

اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی نیت کرتے ہوئے انہوں نے دادا سے ملازمت کی اجازت مانگی۔ انہیں ایک اچھے تعلیمی ادارے سے لیکچرر شپ کی آفر ہوئی تھی جسے انہوں نے شادی کی وجہ سے ٹال دیا تھا، ان کا اجازت طلب کرنے کا انداز اتنا پیارا تھا یا ملازمت بہت باوقار تھی یا پھر شاید بدلتے وقت کا تقاضا تھا کہ وہ مان گئے۔ یہ خبر دوسرے شہر میں سارے خاندان سے کٹ کر بیٹھی میری مٹی تک پہنچی اور وہ تڑپ گئیں۔ لڑنے جھگڑنے کو ایک نیا موضوع مل گیا۔ پیانے لاکھ سمجھایا۔

”وہ گولڈ میڈلسٹ ایم ایس سی ایم فل ہے۔ اسے عمدہ کالج میں لیکچرر لگی ہے جبکہ تم ایک خنیا سے آفس میں اسٹینو کی جاب کرنے چلی تھیں، کیسے اجازت ملتی۔“

لیکن یہ تلخ سچائی مٹی سے ہضم نہ ہوئی اور جھگڑے روز بروز بڑھنے لگے۔ شاداب کے بعد میں آئی اور پھر سیماب کی آمد آمد تھی کہ ایک زوردار جھگڑے کے بعد مٹی میکے چلی گئیں میں اور شاہو پیلا کے پاس ہی تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ مہینہ ڈیرھ مہینہ بعد وہ روٹھ کر سیکے جاتیں اور پھر پیلا منا کر لاتے۔ اس بار شاید پیلا زیادہ غصے میں تھے، منانے نہ گئے۔ تین ماہ گزر گئے اس بے نیازی نے مٹی کو کھولا کر رکھ دیا اور اسی عالم میں انہوں نے انتہائی قدم اٹھا لیا۔ پیلا کو خلع کے نوٹس کے ساتھ ہی دو ہفتے کی سیماب بھی موصول ہوئی۔

چند مشکل ترین دن اور راتیں گزارنے کے بعد وہ اس خود ساختہ سزا سے گھبرا گئے اور ماں کے دامن میں پناہ لینے دوڑے آئے اور وہی دن تھا میرا چودھری ہاؤس میں پہلا دن۔

دادو کو بیٹے کی رہائی اور واپسی سے جہاں خوشی ملی وہیں بکریوں کے ریوڑ میں اضافے نے افسردہ کر دیا۔ بڑے ابو کے ہاں گل بین کے بعد گل پیلا آچکی تھی۔ بڑے پیلا کے عطا اللہ کے بعد کشف اور کائنات نے ان کی فیملی مکمل کر دی تھی جبکہ چاچو اور فضیلہ آنٹی کی فیملی مختصر تھی رحمہ اور حمزہ۔

ایسے میں ہم مٹیوں کی آمد نے عطا اللہ کی قدر اور برصا دی۔ وہ حج بن کے دادو کے پلنگ پہ بیٹھا رہتا اور وہ اسے حلوے، اندھے، مٹھائیاں، میکے، پیسٹریاں اور پھل کھلا کھلا کر موٹا کرتی رہتیں۔ عجیب شخص سا بچہ تھا۔ نہ کھیلتا، نہ شرارتیں کرتا، بس دادو کی گود میں بیٹھا کچھ نہ کچھ ٹھونستارہتا۔ ہم سب اس کی آؤ بھگت سے حسد کرتیں اور جہاں موقع ملتا بدلہ لینے سے نہ چوکتیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لڑکیوں کے اس جتھے کے جتھے سے برا گھبراتا۔ ذرا اکیلا ہوتا تو کبھی شاداب بھوت کا ماسک پہن کر ڈرا دیتی، کبھی میں ٹانگ اڑا کر ڈرا دیتی، کبھی گل پیلا اس لڑھکتے ہوئے گیند کو زوردار دھکے کے ساتھ آگے گرا دیتی، کبھی گل بین چپکے سے اس کی ہوم ورک کا پی کا ورق پھاڑ لاتی۔

دادا کی اچانک وفات نے دادو کو بہت جڑا کر دیا اب وہ کبھی عطا اللہ کو آزاد بھی چھوڑنے لگیں۔ ذرا ان کی عنایات کم ہو گئیں تو ہم سب کے دلوں میں بھی اس کے خلاف نفرت کم ہونے لگی۔ باشعور ہوتے ذہنوں میں اس کے اگھوتے ہونے کا احساس شدت سے جڑ پکڑنے لگا۔ دوسرے وہ تھا بھی ذرا بے ضرر سالز کا۔ ہم سب کے مقابلے میں بے حد سیدھا اور احمق سا۔ رفتہ رفتہ دشمنی دوستی میں بدلنے لگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بڑی امی اور رابعہ آنٹی کی پُر شفقت تربیت ذہن سنوارنے کا کام دے رہی تھی۔

بڑی امی کا اب بھی وہی حال تھا۔ چار چار بیٹیوں کی ماں ہونے کا جرم انہیں دادو سے کبھی قریب نہ کر سکا۔ دادو کے آخری دنوں میں انہوں نے جی جان سے ان کی خدمت کی مگر وہ مقام نہ پاسکیں جو رابعہ آنٹی کا تھا لیکن انہوں نے کبھی رابعہ آنٹی سے حسد محسوس نہ کیا نہ ان کی اہمیت پہ، نہ ہی بیٹے کی ماں ہونے پہ، کیونکہ رابعہ آنٹی بذاتِ خود اتنی اچھی تھیں کہ کوئی ان سے کدورت رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کی ستھری اور نکھری شخصیت کے سارے رنگ ان کی اولاد میں واضح تھے۔ عطا اللہ جو دادو کے اتنے بے جالاؤ پیار کے باوجود بگڑنے نہ پایا تھا اور نہ ہی خاندان بھر کے اگھوتے

لاڈلے سپوت ہونے کا غرور اسے تباہ کر پایا تھا اس کے بعد کشف جو میری ہم عمر تھی اور اب سائیکالوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی اس کی واحد دلچسپی تعلیم تھی۔ بے حد معصوم ذاتیت والی میری یہ کزن ہم سب میں سے کم عمر نظر آتی، حالانکہ میں بیلا رحمہ اس کی عمر کے تھے۔ اس سے چھوٹی کائنات فرسٹ ایئر فول تھی ویسے وہ فرسٹ ایئر میں جانے سے پہلے بھی فول ہی تھی اور آئندہ بھی ان شاء اللہ۔

بڑی امی کی شخصیت کا سب سے گہرا رنگ بے لوث خدمت اور خلوص تھا۔ اپنی چار بچیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہم تین بن ماں کی بچیوں کو بھی سنبھالا۔ وہ تو شاید بھول ہی گئیں کہ ان ساتوں میں سے ان کی اپنی بیٹیاں کون سی ہیں۔ ایک روایتی ماں کی طرح ان کے دل میں بھی بیٹے کی آرزو ہمیشہ زندہ رہی۔ سارے چار انہوں نے کسی رقابت کے بغیر عطا پر پورے کیے اور بھی اپنی ماں جیسی ہی تعظیم انہیں دیتا۔ وہ گل لیلیٰ کی شادی کا ارمان بھی خاصے عرصے سے پالے ہوئے تھیں کیونکہ ان سے چھوٹی گل رخ جنہیں سب رشتہ آتی کہتے تھے دو سال پہلے بیاہ کر کینڈا چلی گئیں اور جانے سے پہلے اپنے اکلوتے دیور سے گل بین کی بات بھی کی کر گئیں اور۔ لیلیٰ آبی اپنی ضد پہ قائم تھیں۔ وہ ڈاکٹر تھیں جبکہ گل بین نے بمشکل بی اے کر کے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور اپنی شادی اور جینز کی تیاریوں میں راضی خوشی مگن تھی۔

سب سے چھوٹی گل بیلا یعنی بیلا جو میری دوست، کلاس فیلو اور ہم مزاج بھی تھی۔ بس چند ایک باتوں کے علاوہ ہماری سب ہی عادتیں پسند ناپسند ملتی جلتی تھیں۔ ہم دونوں ہی بی ایس سی کے پیپرزدے کرفارغ تھے۔

مجھ سے بڑی شاداب نے انگلش لیٹرچر میں ماسٹرز کیا اور آج کل کچھ کمپیوٹر کورسز کر رہی تھی۔ شاداب نے ممی کی چند عادتیں خاصی حد تک اپنالی تھیں۔ اسے ہر کسی سے بلاوجہ بدگمان رہنے کی عادت تھی۔ دادو زندہ تھیں تو ان کی ڈانٹ ڈپٹ کو، اعنت ملامت کو ہم کبھی

بہن کر کبھی منہ لٹکا کر سن لیتے اور پھر بھول بھال جاتے لیکن وہ گھنٹوں کڑھتی رہتی۔ بڑی امی کی عنایات بھی اسے زہر لگتیں، جب کوئی ان کی بے لوث قربانیوں کا ذکر کرتا کہ ”شیریں نے تو دیو پوری کی پچیاں کلیجے سے لگا کر پالی ہیں تو وہ بے تحاشا چڑ جاتی۔ کسی کا احسان قبول کرنا اس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔

جبکہ سیماب مجھ جیسی تھی البتہ تعلیمی میدان میں وہ بلاشبہ مجھ سے آگے تھی۔ میں نے گریڈ بنانے کے چکر میں ایف ایس سی کے پیپرزدو بار دیے تھے جبکہ وہ اسکول میں ہی ایک سال میں دو دو کلاسز پھلانگتی اب ایم بی بی ایس کے فرسٹ ایئر میں تھی۔ تعلیمی میدان میں آگے ہونے کے باوجود اس کی دوستی میسرگ میں پڑھنے والی حمزہ اور فرسٹ ایئر فول کیشی سے تھی کیونکہ تینوں کی عمروں میں ایک آدھ سال کا فرق تھا۔ فینسڈ آئی کی دونوں بیٹیاں ان کی ہی طرح سنجیدہ مزاج مگر سادہ اور پر خلوص طبیعت کی تھیں۔ رحمہ ابن سی اے کی اسٹوڈنٹ تھی اور حمزہ اسکول کے آخری دن نمٹا رہی تھی۔

اور چودھری عطا اللہ نعمت جو اپنے پورے نام پر خوا مخواہ چڑ جاتا تھا، نے ہم سب کی توقعات کے بالکل برعکس آرمی جوائن کر لی۔ اس جیسے نازو نعم میں بے بھالو سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ فوج کی سخت زندگی کے تکلیف دہ شب و روز برداشت کر لے گا۔ لیکن دادو کی وفات نے اس کے معمولات پہ خاصا اثر ڈالا تھا۔ ان کا پیار اور عطا کی ان سے انسیت اپنی جگہ لیکن سچ تو یہ ہے کہ گود میں بٹھا بٹھا کر دادو نے اس کی شخصیت کو پروان نہ چڑھنے دیا۔ اب یہ تو اس کی اپنی فطرت کی اچھائی تھی یا رابعہ آئی کی تربیت کی تھی کہ موقع ملنے پہ اس کی شخصیت کی تمام تر مضبوطی سامنے آگئی۔ آج کل وہ رسالپور میں تھا اور سارے گھر کو اس کی ویک اینڈ کی چھٹی کا انتظار رہتا۔ پچھلے دو ماہ سے وہ ایک دن کے لیے بھی گھر نہیں آیا تھا اور اب اکٹھی چھٹیاں لے کر آ رہا تھا اس خبر نے گھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔

زیادہ آگے پیچھے پھوگی تو وہ بھی سمجھیں گی کہ تم سب اپنے اپنے نمبر بنانے میں مصروف ہو۔ ڈوب مرنے کا مقام ہو گا یہ۔“ اس نے شرم والی تو کشف بھی متفق ہو گئی۔

”ہاں کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو۔“
”اور یار! رشتوں کی کمی انہیں ہوگی جو اپنے بیٹوں کو لیے گھر گھر پسند کروانی پھر رہی ہیں، ہمیں نہیں۔“
شاداب نے اپنی لمبی دودھیا گردن اکڑائی۔ اس ایک سال کے دوران اس کے تین پروپوزل آچکے تھے۔ ایک تعلیم کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا، دوسرا لڑکے کے عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے اور تیسرے پروپوزل میں بڑے ابو کو لڑکے والوں کی جلدی، مشکوک کر گئی۔

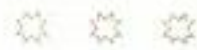
سب کو متفق ہوتے دیکھ کر بیلا پُر جوش ہو گئی۔ ”تو پھر کان کھول کر سن لو، سب لڑکیاں میری ہدایت پہ عمل کریں گی۔ سب سے پہلے تو خبردار جو کسی نے اس پورے مہینے میں بیوی پار لڑکا رخ بھی کیا ہو تو۔“ اس عجیب سی دھمکی پہ شاداب اور کشف دونوں کا موڈ خراب ہو گیا۔ دونوں ہی خود کو پورے گروپ میں سب سے خوب صورت سمجھتی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ جیسے ہم بیوی پار لڑکے ہی تو محتاج ہیں نا! تمہارا تھوڑا ہو گا بیوی پار لڑکا محتاج، میں تو تین سال منہ نہ بھی دھوؤں تو تم سے زیادہ میری جلد چمکے۔“ ان دونوں کے بجائے گل بین عرف بیٹا چمک کے بولی تو سب کو اس کے تین سال منہ نہ دھونے والی بات پہ ہنسی آ گئی۔

”ویسے بھی دو دن بعد تو پہلا روزہ ہے، روزوں میں کہاں یہ سب ہو گا۔“ رحمہ نے بلا مقصد بحث سمیٹی۔
”اور ہاں افطاری پہ سحاب تمہیں اور بیٹا کو زیادہ کارکردگی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ تم دونوں سارا سال کچن میں بھٹلے نہ جھانگو لیکن روزوں میں نت نئے پکوڑے، روٹز اور چاٹ بنانے کے تجربے ضرور کرتی ہو۔ اس سال خدا کے لیے اپنے سکھڑاپے کے ٹریلر مت چلانا۔“

”سحاب کی تو چلو بات سمجھ میں آتی ہے۔ مجھ پہ

سوائے بیلا کے سب ہی پُر جوش تھے۔ وہ نگلی اب تک بچپن کی تمنائیں دل سے لگائے بیٹھی تھی۔ دادو کا پوتوں کو حقیر بھرے اور نفرت انگیز طریقے سے پکارنا اسے بھولا نہیں۔ سب لڑکیوں میں اس نے اس بات کو زیادہ حساس انداز میں لیا اور غیر محسوس طریقے سے وہ رفتہ رفتہ اس بارے میں پختی ہوتی چلی گئی۔ بڑی امی کا بیٹیوں کے بارے میں فکر مندی کا اظہار، اسے دادو کے کلمات یاد دلادیتا۔ عطا کو ملنے والا پیار اور توجہ اسے حسد میں مبتلا کر دیتا۔ وہ اکثر ہم سب کو عطا کے آگے پیچھے گھومنے پہ لٹاؤتی رہتی۔ چھوٹی تینوں مکمل طور پہ اس کے لیکچرز کے اثر میں تھیں لیکن عطا کے معاملے میں وہ تینوں بھی اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ البتہ باقی باتیں وہ بیلا ہی کی مانتیں۔ بیلا کا بس چلتا تو مجھ سمیت کشف، رحمہ اور بیٹا کو بھی اپنی مرضی اور اصولوں پہ چلاتی۔ اب بھی شبنم پچھو کی آمد کی خبر پہ وہ تلملائی ہوئی پھر رہی تھی۔



”میں ایک بار پھر کہے دے رہی ہوں، اس گھر میں کوئی افسانوی سچویشن نہیں دہرائی جائے گی۔“ رات کو جب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد ہم سب چائے پی کر ٹھکن آتار رہے تھے بیلا نے ایک بار پھر تنبیہ کی۔
”اوہو، ایک تو تم اور تمہاری لیسیتیں۔“ بیٹا نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔

”یار ایک بات تو بتاؤ، اس گھر میں مزید کسی افسانوی سچویشن کی گنجائش ہے؟ پہلے ہی خاصا فلمی اور افسانوی ماحول ہے۔ ڈھیر ساری خوب صورت لڑکیاں، ایک سے ایک باکمال، تعلیم یافتہ اور سکھڑ۔ ایک طرح دار سی پھوپھو کی دو جوان گھرو بیٹیوں کے ساتھ آمد۔ وغیرہ وغیرہ، بنا بنایا خاتونی برائنڈ ٹاول ہے۔“ میں نے ہنسی اڑائی۔

”سی لیے کہہ رہی ہوں کہ اب مزید پھندنے ٹانگنے کی ضرورت نہیں۔ پھوپھو کہہ چکی ہیں کہ وہ یہاں بہودیں ڈھونڈنے آ رہی ہیں۔ اب اگر تم لوگ

پابندی کیسی؟ بھی میں تو ایگجڈ ہوں۔" جینا نے تاز سے دائیں ہاتھ کو لراتے ہوئے مٹنی کی انگوٹھی دکھائی۔

"اس غلط فہمی میں مت رہنا۔ شبنم پھوپھو کے آنے سے پہلے ہی ابو، چاچو وغیرہ جیسے غائبانہ غار ہو رہے ہیں ان سے کوئی بعید نہیں کہ پھوپھو کو پسند آجائے کی صورت میں وہ تمہاری اس دو سالہ پرانی مٹنی کو بھی خاطر میں نہ لائیں۔"

"ہائے اللہ۔ نہیں۔" اس نے انگوٹھی والا ہاتھ جھٹ سے پلو میں چھپا لیا۔

"اور سحاب تم کم از کم بسن یا اندوں کا حلوہ مت بنانا۔ اس کے اس نئے آرڈر پر میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ سب جانتے تھے مجھے بیٹھا کھانا بھی پسند ہے اور بنانا بھی۔"

"ہاں ہاں کیونکہ افسانوں میں میں نے بڑھا ہے یہ لڑکے اور ان کی مائیں اکثر ویسٹرن سٹی دو حلوے کھا کر لڑکیوں پہ لٹو ہوتے ہیں۔"

"صبح صبح جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ بدیہی مائیں صبح خیزی کی عادت پہ بھی رہ نہ سکتی ہیں۔"

"لیکن روزوں میں تو تھری اور پھر فجر کی نماز کے بعد دوبارہ سونے کا ہمارے گھر میں کوئی رواج نہیں۔" کشف نے نکتہ اٹھایا۔

"اچھا تو پھر کم از کم نماز کے بعد لان میں ٹہل ٹہل کر مویے کی کلیاں اکٹھی کرنے کی زحمت مت کرنا۔"

"م نے دیکھا ہے اس سے پہلے کبھی کسی کو یہ نا معقول حرکت کرتے ہوئے۔" جیسے مزاج کی رحمہ بھی رنج ہو گئی اس کی فضول تاکیدوں سے۔ لیکن اس کے منہ کے بگڑتے زاویوں کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے اپنا ہدایت نامہ جاری رکھا۔

"اور ان کے بیٹے چاہے ہر تنک روشن، ارجن رام پال، اور میل گبس کی پرسنالٹی کو ہی کیوں نہ مات دیتے ہوں، سب نے اپنے اپنے دل قابو میں رکھنے ہیں۔" اب تو بات سب کی برداشت سے باہر ہو گئی۔

"تمہیں ہم سب اتنی دل پھینک نظر آتی ہیں۔"

شاداب نے اٹھا کے پاس پڑا میگزین اس کے سر پر دے مارا۔

"اب ایک نصیحت تم بھی میری کان کھول کے سن لو۔ گھنٹہ بھر سے تم نے افسانوی پچویشن کی رٹ لگا رہی ہے۔ کیا تم نے افسانوں میں یہ بات نوٹ نہیں کی کہ صبح صبح جاگنگ کرتے ہوئے، لان میں ٹکرانے والی، حلوے پر اٹھے پکا پکا کے کھلانے والی پارلر سے ججن کے آنے والی اور پچلی نظر میں دل ہار جانے والیاں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور ہیرو صاحب کو بعد ان کی والدہ کے وہ کونے میں دبکی رہنے والی گمنام دوشیزہ بھا جاتی ہے جو سر جھاڑ منہ پہاڑ رہنے کی عادی ہے، جو کسی فارن ریٹرن خوبو شہزادے کو قطعی لفٹ نہیں کرائی اور انتہائی بد مزہ چائے بناتی ہے۔ اس لیے محترمہ گل بیلا ہدایت! آپ بھی ذرا اپنی بے اعتنائیوں، کج ادائیگیوں اور بے نیازیوں کو انڈر کنٹرول کریں یہ نہ ہو آپ کی یہی ادا انفرادیت کی وجہ سے کسی کو لوٹ جائے۔" میں نے خبردار کیا اور بیلا واقعی اچھے سمجھدار بچوں کی طرح سر ہلانے لگی۔



اور اگلی صبح تڑکے تڑکے شبنم پھوپھو کی آمد بمعہ ان کے صاحبزادوں کے ہو ہی گئی۔ بڑے فخر کے ساتھ انہوں نے اپنے دائیں بائیں کھڑے لمبے تڑنگے گھبروؤں کا تعارف کرایا۔

"یہ صداقت ہے اور یہ شجاعت۔"

"آلی! یہ نام تو بہت سنے ہوئے لگ رہے ہیں۔" حمنہ نے میرے کان میں سرگوشی کی اور یہ سرگوشی اتنی بلند تھی کہ مجھے فوراً اسے کہنی مارنی پڑی۔

"تم نے اپنی اردو کی بک میں پڑھے ہوں گے۔"

فرسٹ ایئر فول کیشی کے کانوں تک یہ تبصرہ با آسانی پہنچ گیا۔ "وہ ہے نا علامہ اقبال کا شعر۔ سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت اور کسی اور کا بھی ہیں آپلی وہ تیسرا کون تھا؟"

"میرا خیال ہے لیاقت تھا۔" حمنہ کو یاد آگیا۔

چاہا حالانکہ میں پہلے ہی نوٹ کر چکی تھی۔ میں نے آگے تک یہ رپورٹنگ پہنچانے کی غرض سے کمر لیا۔ اکیسوں سے کشف اور رحمہ کو اشارہ کیا۔ کشف تو دیکھ کر مسکرا دی لیکن رحمہ ہونقوں کی طرح گردن گھما گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بیلا کے کان میں سرگوشی کی۔

”اف یہ آپلی آج لگ بھی کتنی غضب کی رہی ہیں۔“

”یہ تم جملہ اتنا توڑ مروڑ کے کیوں کہتی ہو۔ کہیں کا لفظ کہیں لگا کر ساری بات کو عجیب لہریا سا بنا دیتی ہو۔“

اس نے میری گرائمر کی غلطیاں نکالیں تو میں شکایتاً ”ایک ناراض سی نظر ڈال کر پھر سے لیلیٰ آپلی کی طرف متوجہ ہو گئی جو سرسری سے تعارف کے بعد خود پہ پڑنے والی پراشتیاق نظروں سے بے نیاز پلیٹ میں چاول ڈال رہی تھیں۔ لیلیٰ کا پلین بلیک سا وہ سی تراش والا شلوار قمیص تھا جس کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں اور گلے یہ میروں دھاگے کے ساتھ ہلکی سی کڑھائی تھی۔ ابھی اچھی جاگنے کی وجہ سے جلد چمک رہی تھی، باواہی آنکھوں کے غلافی پوٹے ملے ملے سو بے ہوئے تھے، تازہ تازہ دھلا چہرہ سادگی میں بھی سب سے نمایاں تھا۔

بڑی امی کی بڑی تینوں بیٹیاں بالکل ننھیال یہ بڑی تھیں، سوائے بیلا کے۔ گل بیلا نے بوٹا سا قد، لمبی پنھی ہوئی خوابیدہ آنکھیں، داوڑے لی تھیں اور بڑے پاپا کے جیسے سیاہ گھنگھریالے بال، دوھیال کی مخصوص گندی رنگت کے ساتھ وہ خاصی پرکشش نظر آتی لیکن بالی بہنوں سے قدرے مختلف تھیں۔ گل رخ اور گل بین تو ہو ہو بڑی امی کی کاپی تھیں، لمبے ترنگے سرپے، چوڑے چوڑے مضبوط ہاتھ پیر، سرخ و سفید رنگت، بھورے بال اور کرنجی آنکھیں۔۔۔ رنے آپلی تو شادی کے اگلے سال ہی پھول پھول کر بڑی امی کے ساز کی ہو گئیں جبکہ بینا نے مسلسل ڈانگ اور ایکسر ساز کے ذریعے خود کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔

لیلیٰ آپلی البتہ بڑی امی جیسی لگنے کے باوجود ویسی نہیں لگتی تھیں۔ ان کے بال بھی بھورے تھے لیکن

”تو پھو پھو انہیں کیوں نہیں لائیں۔“ کبھی ایک ایک کر آئینوں سے گلے ملتی، پھوپھو کے عقب میں کسی لیاقت صاحب کو ڈھونڈنے لگی۔

میں نے اس کے نیل چہرے بالوں میں چت لگا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شجاعت صاحبہ دلچسپی سے میری حرکت نوٹ کرنے لگے تو میں جخل ہو گئی۔ ان دونوں چھوٹیوں کے مذاکرات انہوں نے کہیں سن نہ لیے ہوں۔ وہ کیا جانیں یہ دونوں اس وقت سنجیدگی سے کسی مسئلے کو ڈسکس کر رہی ہیں نہ کہ ان کے ناموں کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ بڑے صاحبزادے صداقت علی شکلا، ”مزاجا“، ”لباسا“ ہر لحاظ سے سنجیدہ ترین لگ رہے تھے۔ جبکہ شجاعت علی کے لبوں پہ مسلسل پھیلی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ موصوف کو خواخواہ خوش اخلاقی بگھارنے کا عارضہ تھا۔ کڑی ہدایت کے زیر خوف ہم میں سے کسی نے اس مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر دینے کی ہمت نہیں کی تھی کہ بیٹا نے بھی نہیں۔

لیلیٰ آپلی سے مہمانوں کی فوری ملاقات تو نہ ہو سکی کیونکہ ٹائٹ ڈیوٹی کی وجہ سے اس وقت وہ گھر پر نہیں تھیں اور جب ان کی آمد ہوئی، مہمان ناشتے اور غسل سے فارغ ہو کر آرام کرنے جا چکے تھے۔ آپلی نے بھی شاور لینے کے بعد ناشتے اور دوپہر کے کھانے کو اکٹھا نمٹایا اور نیند پوری کرنے کی غرض سے کمرہ بند کر لیا۔ پھر کئی گھنٹوں تک بقول بینا کے آپلی اور مہمانوں کے درمیان نیند کا بیج ہوتا رہا۔ آپلی کی ملاقات ان سے رات کے کھانے پر ہوئی۔ ڈانگ چیر گھسیٹی شبنم پھوپھو اندر داخل ہوتی لیلیٰ آپلی کو دیکھ کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

”یہ۔۔۔ یہ گل ہے۔؟ گل لیلیٰ۔۔۔؟“ انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا، آپلی اس بے ساختہ پذیرائی پہ جھینپ گئیں۔ ان کے آثار سے گل مزید دہکنے لگے۔ متانت سے بیٹھے صداقت علی کی سنجیدہ اور خشک سی صورت پہ پہلی بار خوشگوار تاثرات پیدا ہوئے۔ بینا نے ٹھوکا مار کر مجھے اس طرف متوجہ کرنا

”کرنا کیا ہے؟ ای اور آئیوں کے نرغے میں ہیں۔
ای بہانے بہانے سے ان سے اگلاوے کی کوشش میں
ہیں کہ بیٹیوں کے لیے وہ کس قسم کی بہو میں تلاش کرنا
چاہتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔“

”ہیں۔ دیکھا صاحب! میں نہ کہتی تھی۔ ای باز
نہیں آئیں گی۔ تم چلو ذرا میرے ساتھ۔“ وہ جوش
سے اٹھی مگر میں نے ہاتھ کھینچ کر پھر سے اسے کارپٹ
پر گرا لیا۔

”تم بھلا کیا کر لوگی وہاں جا کر بڑی امی کے منہ پر ہاتھ
رکھ لوگی یا پھوپھو کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لوگی۔“
”کچھ تو کروں گی، بہر حال امی کو یوں دوسروں کے
آگے مذاق نہیں بننے دوں گی۔“ وہ نہیں رکی اور مجھے تو
اس کے ساتھ جانا ہی تھا، کن سوئیاں لینے کی شوقین
بیٹا بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔

”اے شبنم! لڑکوں کے دو خیال میں بھی اک نظر
دوڑا لیتیں۔ چچا، تایا، پھوپھی، کسی کی لڑکی پسند نہیں
آئی؟“ بڑی امی نے ٹوہ لینا چاہی۔ بیلا چپکے سے ماں سے
جڑ کر بیٹھ گئی تاکہ موقع ملے ہی کچھ فوری سدباب کر
سکے۔ اپنی دھیان میں وہ غور نہ کر سکیں کہ بیٹوں کی
محفل میں آنے سے حد درجہ گریز رکھنے والی یہ آدم
بیزار بیٹی اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے۔

”تیسرے بھائی! سسرال کا کیا پوچھتی ہیں۔ برادری
خاصی بڑی سہی لیکن رفاقت کے بعد آپ تو جانتی ہیں
کہ ان کے پھیلے ہوئے کاروبار کی وجہ سے میں ساؤتھ
افریقہ چھوڑ کر پاکستان نہ آ سکی اس لیے رشتے کے
بھائی بہنوں سے اتنا میل ملاپ رہا نہیں اور نہ ہی اب
نئے سرے سے قائم کرنے کی تمنا ہے اور جو سنگے بہن
بھائی ہیں رفاقت کے تو خیر ان سے تو خون کا رشتہ ہے
میرے بچوں کا اسی لیے یہاں لے کر آتی ہوں لیکن
نئے رشتے جوڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ میرے سسرال
میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں
دونوں نندوں کی ایک ایک بیٹی تھی، سالوں پہلے بیاہ کر
فارغ ہو چکیں اور رفاقت کے بڑے بھائی صاحب کے
تو خیر جو نگے کا ایک ہی بیٹا ہے۔“

مجھے اور لمبے بے حد تھے، آنکھوں کی کرنجی رنگت میں
تیزی کم اور بادامی نرمی زیادہ تھی اور سب سے بڑھ کر
نزاکت جو انہیں سب سے ممتاز کرتی تھی۔ یہ نزاکت
ہی ان کا خاصا تھی جو ہر بات سے جھلکتی تھی، لمبے
سروقد، جسم کے ہلکے پن میں بھی، لمبی لمبی مومی
انگلیوں کی برف سی سفیدی میں بھی، مڑی ہوئی پٹکوں
کے اٹھنے کرنے میں بھی، مہربان سے لمبے کے شائستہ
اتار چڑھاؤ میں بھی اور سب سے اچھے پاؤ قارقد موموں میں
بھی۔

صدائق علی کی ساری بے نیازی ہوا ہو گئی تھی۔
ان کا بار بار لیلیٰ آلی کو کن آنکھوں سے دیکھنا کسی سے
بھی نہ چھپ سکا تھی کہ شبنم پھوپھو سے بھی نہیں اور
حیرت انگیز طور پر کچھ منٹ قبل لیلیٰ آلی پہ تار ہو
جانے والی پھوپھو کا چہرہ تن گیا اور انداز روکھا سا ہو گیا۔
بیلا نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں آندھے
اچکا کے رہ گئی۔ ہم ”بکریوں“ کی تقشیش کاروائیوں اور
دانشورانہ تجزیہ نگاری سے بالکل الگ بڑے ابو بڑے
بیلا، پیلا اور چاچو بھانجوں کی خاطر بدارت میں مصروف
تھے جبکہ ہماری سادہ لوح ماں میں نند کے بگڑتے مزاجوں
سے ناواقف مسلسل مسلمان نوازی کے فرائض نبھا
رہی تھیں۔

”تم نے دیکھا صاحب! کتنا چھپورا نکالا یہ صداقت
علی ولدر رفاقت علی ولد۔ پتہ نہیں کیا بالکل اچھرو بازار
میں چوڑیوں کے اسٹال لگانے والے لونڈوں کی طرح
منہ اٹھائے آلی کو تار رہا تھا۔“ بیلا نے موقع ملے ہی
مجھ پر دل کا غبار نکالا۔

”نہیں خیر! ایسی بات بھی نہیں۔ ہاں، دو تین بار نظر
ضرور ڈالی تھی اس نے آلی پہ، سراسر ہنے والی یا پھر شاید
متاثر ہو جانے والی مگر جو مثال تم دے رہی ہو، ویسی کھا
جانے والی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سالم نگل جانے
والی نظر تو نہیں ڈالی انہوں نے۔“

”یہ شبنم پھوپھو کیا کر رہی ہوں گی اس وقت؟“

جواب دیے جا رہے ہیں اور وہ بھی حساب لی لی کو جسے سامنے پاتے ہی تمہاری ٹانگیں بندھ جایا کرتی تھیں۔“ شاداب نے خواہ مخواہ کی برزگانہ شفقت دکھاتے ہوئے اس کے بکھرے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر مزید نگاہ پیدا کیا۔
”ہاں جی اب تو موصوف مرد مجاہد ہیں اتنی ہمت تو پیدا ہو گئی ہوگی۔“ بیلا نے میگزین کی اوٹ سے جملہ پھینکا۔ عطا اللہ میگزین کے سرورق پہ دھری لمبی لمبی انگلیوں اور ذرا اوپر سے جھانکتی گھنی گھٹنگھریالی لٹوں کو دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔

”نہیں۔ ابھی اتنی ہمت نہیں ہوئی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بظاہر کیشی کی گود میں کھلی ابہم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بعد میں رات کو لان میں واک کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔
”کیا شبنم پھوپھو کے آنے کا مقصد ہی ہے جو میں سمجھ رہا ہوں۔“

”اب میں کیا جانوں تم کیا سمجھ بیٹھے ہو۔“ میں نے ذرا آگے ٹپکتے ہوئے صداقت اور شجاعت کے خیال سے بہت آہستہ آواز میں کہا۔
”یہی کہ وہ پتھراؤ کرنے آئی ہیں۔“
”پتھراؤ؟“

”ہاں ایک آدھ بیری ہو تو آنگن میں کنکری آتی ہے اور جہاں بیروں کا جنگل کھڑا ہو وہاں تو پتھراؤ ہی ہو گا نا۔“

”ہاں پنچے تو تمہارے خیال کے گھوڑے بھی ٹھیک ہی جگہ ہیں۔“

”تمہاری یہ فضول عادت نہیں گئی۔ سیدھے سادے جملے کے الفاظ آگے پیچھے کر کے عجیب پہیلی سا کر دیتی ہو۔ بات کا مطلب سمجھنے میں ہی کتنی دیر لگ جاتی ہے۔“ وہ ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔ ”سیدھی طرح کہو کہ تمہارے خیال کے گھوڑے ٹھیک جگہ پنچے ہیں۔“

”بات سمجھ میں آگئی ہے نا؟۔ تو پھر اتنا گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے اور کسی کو تو اعتراض نہیں ایک وہ بیلا

”بس۔ بس ایک ہی بیٹی بھی کوئی نہیں؟“ بڑی امی شک و حسد کے طے جلتے جذبات سے مغلوب ہو کر عجیب حسرت بھرے لہجے میں پوچھ بیٹھیں۔

”ہاں ایک ہی بیٹا ہے۔ پروفیسر ہے اس کی ماں تو خود کب سے سو تھلاستی پھر رہی ہے۔ سہیاس بھی نوں آیا تھا کہ وہاں ساؤتھ افریقہ میں کوئی ہو تو بتاؤں۔ اب بھلا ہوتی تو میں اتنی دور کیوں آتی۔“
”ہاں رشتے طے کرنا بھی ایک مسئلہ ہے، چاہے بیٹوں کا ہو چاہے بیٹیوں کا۔“

بڑی امی نے سرد آؤ بھری۔ بیلا کو بے چینی سی محسوس ہوئی اس سے پہلے کہ بڑی امی مزید کچھ کہہ کر اس کو اور ڈسٹرب کر تیں، سیما اور حمزہ کی خوشی سے بھرپور چیخوں نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ رابعہ آنٹی کے چہرے پہ مسکراہٹ کھل گئی، شاید ماں کو فضا میں ہی اپنے لالچے کے آنے کی خبر ممک بن کر مل گئی تھی۔
”مٹی بھیا آگئے، مٹی بھیا آگئے۔“

”خیر میرا شہزادہ آگیا۔“ بڑی امی کے چہرے پہ پھیلا مال اور حسرت بھی آنا ”فانا“ غائب ہو گئی۔ پھر کتنی ہی دیر تک سب کی توجہ کا مرکز عطا ہی رہا۔ شبنم پھوپھو کے انہیں بھی اپنے مکے کا یہ اکلوتا وارث بڑا بھایا تھا۔ بڑی امی کو ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ سبزیوں اور دالوں کو دیکھ کر غش کھانے والا ان کا چٹورا بھتیجا میس کے کھانے کیسے زہر مارنا کرتا ہو گا۔

”آئے ہائے اتنا سامنے نکل آیا میرے چاند کا۔“ اور اتنا سامنے سن کر میری تو ہنسی ہی چھوٹ گئی۔ بیبا پچھ بن کر بیٹھے عطا نے مجھے کھور کر دیکھا۔

”ہائے اللہ بڑی امی! ایسے تو مت کہیں، آپ کے لٹو پیڑے کے چہرے کے طول و عرض پہ کوئی چیز اثر انداز نہیں ہو سکتی۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے، جو بھی کھاتا ہوں نظر تو آتا ہے تمہارے طرح نہیں کہ منہ چوبی اور ٹیڈ کھوئی۔“ (منہ چومے جیسا اور پیٹ کنویں جیسا۔)

”واہ جی واہ ہمارے اونٹے بونگے عطی کے تو بڑے پر پرزے نکل آئے رسا پور جاتے ہی۔ اب تو پڑ پڑ

ہے اور ایک تم ہو۔“ میری بات کٹ کر وہ جلدی سے بولا۔

”ذرا پھر سے کہو۔ ایک بیلا ہے اور ایک میں۔“
”کیا۔ کیا مطلب۔؟“ میں کچھ بھی نہ سمجھی اور پیچھے سے سیماعطا کا بازو کھینچ کر وہ سری طرف لے گئی وہ مجھے سمجھا بھی نہیں سکا۔



”سحاب! تم ٹھیک کہتی تھیں۔“ رات کو فنی کے بیلے کو انگلیوں سے چاٹتے ہوئے بیلا نے زور زور سے سر ہلا کر رائے دی۔ آج پہلا روزہ تھا اور حسب روایت پہلی افطاری خاصی پر اہتمام تھی اور کچھ مہمانوں کے خیال سے اور بھی رات گئی وانگٹک ٹیبل پر اتنا پیٹ بھر گیا تھا کہ سوپ ڈش کی خواہش ہی نہ رہی تھی۔ اب تراویح کا اکرے کے بعد دوبارہ چائے کا دور چلا تو میں اپنے بڑا کے اور ”ٹف“ کے حصے کی فرنی اٹھا لائی۔

”تم بالکل صحیح کہہ رہی تھیں میں انہوں میں تم لوگوں کو ہدایتیں دے دے ورنہ گمراہ رہی تھی۔“ واقعی پس منظر میں رہی گئی چیز زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ صداقت صاحب بھی لٹو ہوئے تو لیلیٰ آتی یہ جنہوں نے شاید انہیں ایک نظر بھر کے بھی نہ دیکھا ہو گا۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتی ہوں گی کہ پھپھو کے ساتھ آنے والے ان کے بیٹے تین ہیں یا دو ان کے نام کیا ہیں اور اگر نام جانتی ہوں گی تو یہ پتہ نہ ہو گا کہ صداقت علی کون ہے اور شرافت علی کون۔“

”شرافت نہیں شجاعت۔“ کشف نے تصحیح کی۔

”وی وی۔“ وہ بد مزہ ہوئی ٹوکے جانے پر۔ ”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ان صداقت میاں نے بڑی غلط جگہ دل ٹھہرا لیا۔ لیلیٰ آپلی تو وہ پتھر ہیں جنہیں اتنے سالوں سے امی اور ابو اناج برابر نہ ہلا سکے تو یہ سات سمندر پار سے آنے والے پروڈی کی بساط ہی کیا۔“
”پہلی بات تو یہ کہ تم یہ ثابت نہیں کر سکتیں کہ صداقت علی نے واقعی دل ٹھہرا لیا ہے یا پھر صرف نظر

جھائی ہے۔ میرا مطلب ہے، یہ صرف پسندیدگی بھی تو ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے ان کی والدہ انہیں لکھا پڑھا کر ہی لائی ہوں گی، اسی نیت سے وہ ہر لڑکی کو جانتے ہوں گے۔ فی الوقت انہیں لیلیٰ آپلی پسند آتی ہیں، ہو سکتا ہے ان کی طرف سے انکار ہونے پر وہ نظروں کا رخ بدل کر کہیں اور فوکس کر لیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ لیلیٰ آپلی کو انکار ہی کرنا ہے۔“ میں نے ماہرانہ تجزیہ پیش کیا۔

”ظاہر ہے وہ اپنا سالوں پر انار پکا رو تو نہیں توڑیں گی۔“

”اور توڑنا بھی نہیں چاہیے، کوئی تو ہو اس سسٹم سے بغاوت کرنے والا اسی لیے تو لیلیٰ آپلی میرا آئیڈیل ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر ارادہ مضبوط اور نیت نیک ہو تو ”چودھری ہاؤس“ جیسے روایتوں اور ضابطوں میں جکڑے گھر میں رہ کر بھی کوئی لڑکی اپنا آپ اٹھا سکتی ہے۔ اس گھر میں کوئی مسز چودھری ہے تو کوئی ڈائریکٹر فلاں فلاں چودھری صرف وہی ہیں جنہیں ان کے اپنے نام سے بھی دنیا جانتی اور پہچانتی ہے ڈاکٹر گل لیلیٰ چودھری کی نیم پلیٹ دوا، ابو اور بڑے پیلا کے ناموں سے ذرا الگ ہی سہی مگر اس کو بھی کے باہر آویزاں تو ہے۔“

اس نے عقبی حصے میں بنے آپلی کے اس کلینک کا حوالہ دیا جہاں شام کو وہ عورتوں اور بچوں کا مفت علاج کرتی تھیں۔

”لیکن اس سارے معاملے کا شادی سے کیا تعلق؟“ کشف نے نکتہ اٹھایا۔ ”بہت سی ڈاکٹر“ انجینئر، پروفیسر اور بیورو کریٹ لیڈرز میرڈ ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ شادی کسی بھی طرح کسی عورت کے کیریئر پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ ہاں بس عورت میں اتنے نفس ہونے چاہئیں کہ وہ میرڈ لائف اور پروفیشنل لائف کو بیلنس رکھ سکے۔ جو یہ نہیں کر پاتی وہ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتی ہے۔“ کشف کی رائے سے میں بھی پوری طرح متفق تھی۔

”جب ایک مرد پوری طرح اپنی بیوی پہ حاوی ہو

رازی کی طرح سنے میں چھپائی یہ حقیقت میں جوش بیاں
میں عیاں کر بیٹھی اور اب وہ دونوں مجھ سے پوری
تفصیل سے بغیر تو میری جان نہیں چھوڑنے والی
تھیں۔

”یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ نے ایف ایس
سی میں پوزیشن لینے کے بعد کنگ ایڈورڈ میں ایڈمیشن
لیا تھا۔ ابھی وہ ایم بی لی ایس کے فرسٹ ایئر میں ہی
تھیں کہ فاسٹل ایئر کے عمر رحمان سے ایک خوب
صورت سے رشتے میں بندھ گئیں۔

بندہ شریف تھا اور ظاہر ہے کہ مخلص بھی اس لیے
سیدھے بھاؤ اپنے ماں باپ کو چودھری ہاؤس رشتہ
دے کر بھیج دیا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دوا کی وفات ہو
جانے کے بعد دادو ان کے وضع کردہ اصولوں کے
پارے میں پہلے سے بڑھ کر اٹل اور حساس ہو چکی
تھیں۔ عمر رحمان سرائیکی بولنے والے ملتان کی گھرانے
سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کس ذات
برادری سے تعلق رکھتا تھا لیکن دادو کے بقول اس
ذات کے لوگوں کا قدیم پیشہ چارپالی بنانا اور چھری چاقو
تیز کرنا تھا۔ اب بھلے سے عمر رحمان کے باپ دادا
زمیندار ہوں، انہیں کیا۔ وہ تو چاقو چھری تیز کرنے
والے اور گلی محلوں میں گھوم گھوم کر مٹی کسوا لو کی
صدائیں دینے کی شہرت رکھنے والے خاندان میں بیٹی
دینے تیار نہ تھیں۔“

”لیکن دادو نے ان کی سات پشتیں کیسے
کھنگالیں؟“ کشف نے سوال کیا۔

”ارے یہ پرانے زمانے کے لوگ ایک ہی علم تو
حاصل کرتے تھے، دوسروں کے حسب نسب اور شجرہ کا
حساب کتاب یاد رکھنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔“
بیلا جل کر بولی۔

”اور پھر ضروری نہیں کہ یہ سب سچ ہی ہو۔ کچھ
باتیں یونہی مشہور ہو جاتی ہیں لیکن لوگ ان پر اندھا
یقین کرنے لگتے ہیں۔ یہی حال دادو کا تھا وہ کہتی تھیں
کہ شیخ برادری حد درجہ نجوس ہوتی ہے، عورتوں پہ
پیسہ خرچ کرنے کی روادار نہیں اس لیے وہاں بیٹی دینے

جاتا ہے، اس کی ہر پسند ناپسند پر اثر انداز ہو جاتا ہے تو وہ
بے چاری عورت اپنی پروفیشنل لائف اور ڈریسز کو کیسے
اس لیے اثر سے بچا سکتی ہے۔“ وہ اپنے موقف پہ ڈٹی
ہوئی تھی۔

”بات یہ ہے گل بیلا صاحبہ! کہ آپ کو ڈائی کئے
ہوئے چھوٹے چھوٹے بالوں والی کالے ہونٹوں میں
دبے سگریٹ کے کش لگانے والی اور چھوٹے چھوٹے
بلاؤنڈز کے ساتھ باریک باریک ساڑھیاں پہننے والی
سوشل ورکر لیڈرز کی طرح ”بیچاری عورت“ بے چاری
عورت کہنے کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔“

”بالکل غلط۔“ وہ میرے سچ کی تاب نہ لا سکی اور
پھر کرچلا اٹھی۔ ”میں عورت کے ساتھ گئے اس دم
چھلے“ ”بے چاری“ ہی کے تو خلاف ہوں یا تو اس کے
نام کے آگے مسز لگا ہو گا اور اگر نہ ہو تو از خود بے چاری
کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسے میں لیلی آپ کی مثال
ہمارے لیے قابل تقلید ہے انہوں نے نہ خود کو بے
چاری کہلانے دیا نہ ہی مسز ہونے کا سہارا لیا۔ آج ان
کا سوسائٹی میں مقام ہے، اپنی ایک جگہ ہے، ایک
محفوظ اسٹینڈ ہے۔ گھر میں بھی انہیں نمایاں حیثیت
حاصل ہے۔“

”ہاں لیکن۔“ میرے خیال میں تو وہ بے چارہ ہی ہیں
اور یہ جو بڑی امی، بڑے ابو، ان کے ہر رشتے پر انکار کو
آرام سے پی جاتے ہیں اور دل ہی دل میں ان کی بڑھتی
عمر اور اس سے بھی بڑھتی ہنٹ دھڑی پہ فکر مند ہونے
کے باوجود ان سے زبردستی کرنے سے سب ہٹکچاتے
ہیں تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کے قابل
ڈاکٹر اور سرجن ہونے سے مرعوب ہیں۔ اس کی وجہ وہ
احساس جرم اور پشیمانی ہے جو انہیں بیٹی کو بے آباد دیکھ
کر ستاتا ہے۔ انہیں اس حد تک پتھر کرنے کے ذمہ

دار وہ خود ہیں ورنہ۔۔۔ ورنہ یہ وہی آپلی ہیں ان کی
آنکھوں میں بھی خواب کروٹیں بدلتے تھے، ان کے
لب بھی کسی کی صدا کے جواب میں کھل اٹھتے تھے۔“
ان دونوں کی بحث نے کچھ اس طرح طول کھینچتے ہوئے
مجھے اپنی پلیٹ میں لیا کہ کئی سالوں سے کسی مقدس

ہے لیکن اپنی بیٹیوں کو کسی بھی متوقع پریشانی سے بچانے کے لیے ہمارے بزرگ شدید جذباتی سوچ رکھتے ہیں۔

”چاہے بیٹی اسے فیس کرنے پر دل و جان سے تیار ہی کیوں نہ ہو۔“ بیلا نے گفتگو کا رخ پھر سے آپلی کی طرف موڑا۔ ”ویسے یار دادو کو پتہ چل گیا تھا کہ آپلی کی پسند بھی اس میں شامل ہے؟“

”ہاں اور اصل مصیبت ہی تب شروع ہوئی۔ عمر رحمان کی والدہ کو صاف انکار ہونے کے بعد آپلی نے ہی رہنے آپلی کے ذریعے بڑی امی تک بات پہنچائی۔ دادو کو علم ہوا تو جیسے طوفان آگیا۔ اسی دن وہ خاتون دوبارہ رشتہ لیے چلی آئیں اور اس دن دادو نے غیض و غضب میں گھر آئے مہمان کا لحاظ تک نہ کیا۔“ میں نے بتایا تو کشف چپ نہ رہ سکی۔

”ایک بات تو بتاؤ، تمہیں اتنی تفصیلات کا علم کیسے ہے؟ اگر تمہاری جگہ بیلا یہ سب بیان کر رہی ہوتی تو بات ہضم بھی ہوتی ہے اسے شروع ہی سے کن سویاں لینے کی عادت ہے۔ تم نے اتنے ڈھکے چھپے معاملے کی تفصیلات کہاں سے چرائیں۔ ہم نے تو اتنے سالوں سے کبھی ہلکا سا تذکرہ بھی نہیں سنا۔“

”بس اتفاق کی بات ہے۔ یاد ہے جب تم کھٹی اور عطا آئی کے ساتھ پیرس گئے تھے اپنے گرینڈ پا سے ملنے اور بیلا، بیلا دونوں اپنے ماموں کے پاس ڈیرہ اسماعیل خان گئی ہوئی تھیں۔ گرمیوں کی طویل لمبی دوپہر میں تمہیں اور تعطیلات میں اکیلے رہنے کی بوریت میں اکثر رہنے آپلی کے کمرے میں گھس جاتی اور ان کے ڈائجسٹ چانا کرتی، وہ اندر آتیں تو جلدی سے سوتی بن جاتی کیونکہ انہیں بچیوں کا افسانہ ناول پڑھنا پسند نہیں تھا ایسی ہی ایک دوپہر میں دیوار کی طرف کروٹ لیے ایک رومافٹک سا افسانہ پڑھ رہی تھی کہ دروازے پہ آہٹ ہونے پر جلدی سے رسالے والا ہاتھ نیچے کر کے پلنگ کے نیچے چھپا لیا اور آنکھیں میچ لیں۔ رہنے آپلی روتی ہوئی لپٹی آپلی کو گھسیٹ کر اندر لا رہی تھیں۔ کھلے دروازے سے زور زور سے بولتی دادو

کا مطلب ہے اسے فاقوں مارنا اور ایک ایک چیز کے لیے ترسانا۔“ میری بات کی تردید کشف نے فوراً کی۔ ”خیر، یہ تو غلط ہے۔ میری دوست روشائے کو تو جانتی ہوگی تم۔ وہ بھی شیخ گھرانے سے ہے۔ اللہ کیا بتاؤں کس حد تک فضول خرچ ہے ساری فیملی۔ خود یہ تو لاکھوں خرچ کرتے ہی ہیں، صدقہ خیرات یہ بھی کروڑوں وقف کر رکھا ہے۔ پچھلے سال کئی مہینے میں اس کے بھتیجیوں کے عہدے پر ایک ایک عورت کئی کئی کلو سونا لاوے ہوئے تھی۔ دس تو ڈشز تھیں ڈنر میں اور ایمان سے کیا شاندار فنکشن تھا۔ اس لحاظ سے تو ہم کچھ نہ ہوئے۔ کسی کی برتھ ڈے پہ کبھی ایک پونڈ کا کیک تک نہیں کٹا۔“

”وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ بات میں حقیقت ہو یا نہ ہو اگر شہرت ہو جائے تو سب ہی یقین کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دادو اپنے موقف پہ سختی سے قائم تھیں کہ بے شک عمر رحمان کی فیملی شامان میں رہتی ہے، بے شک اس کی بھینس کلج میں پڑھتی ہیں، بے شک اس کے والد نے زمینداری ترک کر کے ڈروڈ یہ الیکٹرونکس کا بزنس شروع کر رکھا ہے لیکن اگر وہ ملتان ہی ہے تو پھر ضرور اس کے آبواجد اوچاڑیاں بننے اور بیٹریاں ٹھونکنے ہوں گے اور اگر اس کی ماں سرانگی بولتی ہے تو ضرور لڑاکا اور جتھ چھٹ بھی ہوگی اس لیے وہاں ہرگز ہرگز اپنی پوتی نہیں دیتی۔“

”کمال ہے، بیٹوں کے لیے تو ایسے سخت اصول نہیں تھے بڑی ہو، افغانی، دو سری فرانسسی، چھولی والی اردو اسپیکنگ فیملی سے۔ یاد ہے نا کبھی بھی دادو جب پنجابی بولنے کے لیے ترس جایا کرتی تھیں تو یہ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتیں کہ قسمت نے بھی کیا بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی ہوئیں ان کے سر منڈھ دی ہیں، کسی کے مذکر مونث کی سمجھ نہیں آتی تو کسی کی فرمائے بھرتی رواں اور شستہ اردو سر سے گزر جاتی ہے۔“

”یہی تو دہرے معیار ہیں ہماری سوسائٹی کے گھر میں آنے والیوں سے ایڈجسٹمنٹ کی توقع رکھی جاتی

کو نوچا گیا ہے، جس گندے طریقے سے میری محبت کو بدنام کیا گیا ہے اور جس ظالمانہ طریقے سے ایک شریف انسان کی بے عزتی کی گئی ہے جس طرح میری ماں کی تربیت کو گالیاں دی گئی ہیں اور میری تعلیم پر چار حرف بھیجے گئے ہیں، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

”بھول جاؤ لیلیٰ! یہی بہتر ہے تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔“

”کرنے کو تو بہت کچھ کر سکتی ہوں اور کچھ نہیں تو دادو کے بے بنیاد گندے الزامات کو سچ بھی ثابت کر کے دکھا سکتی ہوں لیکن میں ایسا کروں گی نہیں۔ نہ تو ان کے کہنے سے میری ماں کی تربیت کے رنگ ہلکے پڑ سکتے ہیں اور نہ ہی عمر رحمان کوئی ایسا بچہ انسان ہے جو بے عزتی کے بدلے بے عزتی کرے۔ میں کچھ نہیں کروں گی صرف ابو اور امی کو زندگی میں کبھی نہ کبھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور کروں گی کہ وہ غلط ہیں، انہوں نے میرے ساتھ غلط کیا۔ میں اور کچھ نہیں تو انہیں یہ احساس ضرور دلاؤں گی کہ خاندان اور بزرگوں سے عقیدت اپنی جگہ لیکن ان کی اولاد کا بھی ان کی زندگیوں پر کوئی نہ کوئی حق ضرور ہوتا ہے۔ اولاد کے دل کا خون گر کے ماں کے قدموں میں رکھنے کا شرف حاصل کرنا، جنت کا شارٹ کٹ رستہ نہیں ہے۔“

میں نے سالوں پہلے اپنے دل و دماغ میں نقش ہونے والے گل لیلیٰ آلی کے پر عزم جملے من و عن دہرا دیے۔ اپنی کم عمری کے باوجود ان کے دل کی تمام حسرتیں میں نے شدت سے محسوس کی تھیں۔ اس وقت میں جس کیفیت سے گزری، اس وقت کشف اور بیلا بھی اسی احساس کے زیر اثر تھیں لیکن بیلا شاید کچھ اور بھی سوچ رہی تھی۔ شاید اسے اپنے آئیڈیل کے ٹوٹنے کا ملال تھا۔



”تین سال ہو گئے برخوردار تمہیں شیوہ نہ کرنا آئی۔“ چاچو کی آواز پر تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اترتا عطاؤںھیلا پڑ گیا۔

کی غضب ناک آوازیں آئیں۔ کسی نے زور سے دروازہ بند کیا تو یہ شور تھا۔

”باگل ہوئی ہو لیلیٰ! اس وقت دادو کے آگے کھڑا ہونا آپ اپنی شامت بلوانے کے مترادف ہے۔“

رہنے آلی کی آواز آئی۔ جواب میں آلی کی سسکیوں بھری فریاد۔

”لیکن رہنے! ذرا دیکھو تو دادو کیا کچھ کہہ رہی ہیں عمر کی امی کو۔ اتنے تذلیل بھرے القابات اور اتنی بے عزتی۔ اف۔ کوئی انہیں روکتا کیوں نہیں۔“

”کون روک سکتا ہے؟ امی وہ بے چارہ تو خود لپیٹ میں آئی ہوئی ہیں، صبح سے متواتر انہیں بیٹیاں پیدا کرنے اور پھر ان کی غلط تربیت کرنے کے طعنے مل رہے ہیں۔ رہے ابو، تو ویسے تھے نہیں جیسے دوا کی وفات کے بعد دادو نے انہیں بتا دیا ہے یہ کہہ کہہ کر کہ اب دوا کے بعد وہی چودھری ہاؤس کی روایتوں اور روایوں کے امین ہیں۔ وہ بھی کی محبت میں ماں سے نافرمانی کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ ہاں بڑے پیایا چاچو ہوتے تو شاید کچھ بات بنتی۔“

”بے شک انکار کر دیں لیکن مجھ پر عمر یہ اور ہمارے مخلص سے معصوم جذبے پر اتنے گھناؤنے الزام تو نہ لگائیں۔ اس شریف عورت کی سات نسلوں کے پرچے تو نہ اڑائیں جو ایک بار صاف انکار کے باوجود صرف بیٹے کی خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے دوبارہ یہاں ذلیل ہونے چلی آئی ہے۔“

”فکر مت کرو وہ جا چکی ہیں، دادو تو بو نہی اب کئی گھنٹے بولتی رہیں گی۔ کاش رابعہ آئی ہو تیں یا پھر بڑے پیایا تو اتنی بد مزگی پیدا نہ ہوئی۔ بات سلیقے سے بھی تو ختم کی جاسکتی تھی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔“

”بہت برا ہوا ہے بہت برا۔ اتنا برا کہ تم میں سے کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ معاملے کی سنگینی کا اندازہ امی، ابو اور دادو کو رفتہ رفتہ ہو گا۔ ان لوگوں نے مجھ سے میری خوشی مانگ لی ہوتی تو میں ماں باپ کی مرضی پر خود کو قربان کر دیتی۔ خوشی خوشی اپنی آنکھوں کے پہلے خواب کو توڑ دیتی لیکن جس بے دردی سے اس خواب

”وہ۔۔۔ چاچو۔۔۔ یہ تو بس۔۔۔“ وہ زخموں سے چور چور
چرو سہلا کر رہ گیا۔

”صد اقت اور شجاعت کو لاہور تو گھما پھر لاؤ۔ یوں
تو میں بھی فارغ ہوں لیکن تمہاری کمپنی میں یہ دونوں
زیادہ اچھا مل کر س گے۔“

”چلیں چاچو! آپ نے یہ تسلیم تو کیا کہ آپ بزرگ
ہو چکے ہیں۔“

”ایسی بات بھی نہیں، اب کیا کیا جاسکتا ہے جو
قسمت نے تم جیسے جوان جہاں لوگوں کا مانا چاچا بنا دیا
ہے۔ میں اسی لیے تو تم لوگوں کے ساتھ باہر نکلنے سے
پرہیز کرتا ہوں، میری اچھی بھلی پرستائی کا بیج خراب
کر دیتے ہو، چاچو، چاچو کہہ کر لو کہ اب یہ ماموں کہنے
والوں کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔“ وہ شائستگی سے کہہ کر
صد اقت اور شجاعت کو عطا اللہ کے ساتھ آؤٹنگ کے
لیے نکلنے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے
گئے۔

”چلو بار! اسی زمانے ہم بھی عرس بعد لاہور کو ذرا
تفصیلی دیکھ لیں۔“

”مہمیس تو لاہور بہت یاد آتا ہو گا وہاں جا کر۔ کیا
نام ہے اس جگہ کا سنا ہے چھوٹا سا قصبہ نما شہر ہے۔“

”ہاں مگر بہت خوب صورت اور بے فضا اور وہاں
میری روٹین اتنی ٹف ہے کہ کسی کو یاد کرنے کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں کچھ یادیں بڑی دھیت ہوتی ہیں،
آپ گرو نہ کرو وہ خود ہی ہر وقت سر پہ سوار رہتی
ہیں۔“

”واٹ؟“ شجاعت اتنی جلدی عطا کی بے ربط گفتگو
کا عادی کیسے ہو سکتا تھا۔

”میرا مطلب ہے وہاں رہ کر تو زیادہ احساس نہیں
ہوتا لیکن دو چھٹیاں بھی گھر گزار لوں تو اگلا سارا دن
رساپور میں بڑا بے مزہ گزرتا ہے۔ ہواؤں میں نسوار
کی بورچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر چیز سلو موشن میں
حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ لاہور سے بچ کر رہنا یہ بڑی
جلدی اپنا عادی بنالیتا ہے۔“ اس نے وارننگ دی اور
پھر اچانک میری طرف مڑا۔ میں قریب ہی ڈانٹ

نیمبل کی صفائی کر رہی تھی۔

”مہمیس کیا روزہ بہت لگ رہا ہے۔ بڑی چپ چپ
ہو۔“

”ویسے ہی۔۔۔ بس نیند آرہی ہے۔“ میں نے ٹالا۔
”آپ لوگ سحری پہ اتنا اہتمام کرتے ہیں، ضرور کئی
گھنٹے پہلے جاگ کر تیاری شروع کرتی ہوں گی۔ پلیز
آپ اتنا تکلف مت لیجئے، بہت شرمندگی ہوتی ہے
آپ کو بے آرام دیکھ کر۔“ صد اقت علی جو خاموشی
سے سی این این پہ نیوز دیکھ رہے تھے، سنجیدگی سے
کہنے لگے۔

”جی ہاں بھائی! ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ یقین
لیجئے، ہم وہاں بریڈ، جیم اور چیز کے ساتھ کھا کر بھی
روزہ رکھ لیتے ہیں۔“

”لیکن یہ پاکستان ہے میرے بھائی! یہاں عید تو
عید، سحری بھی منائی جاتی ہے۔ انطاری کو بھی
سیاہیٹ کیا جاتا ہے۔“ عطا نے کہا۔

”جی۔۔۔ یہ بالکل درست ہے، ہم لوگ واقعی روزوں
کو اہتمام سے رکھتے ہیں نہ کہ سر سے بوجھ کی طرح
اتارتے ہیں اور مسمان نوازی میں جو لطف ہے اس
سے تو آپ ہمیں محروم کرنے کی بالکل بھی کوشش
مت کیجئے گا۔“

نسیبہ آئی نے اندر آتے ہوئے کہا اور میری
مشکلی آسان کی۔ مجھے عجیب نہیں آ رہا تھا کہ گفتگو کا
پرچ کیسے موڑوں میری ڈسٹنس کی وجہ لیلی آپی
تھیں۔ صبح معمول کے مطابق ان سے سامنا ہوا۔ ان
کا راز یوں افشا کر دینے پہ میں دل ہی دل میں ان سے
شرمندہ تھی اور نظر نہیں ملا پارہی تھی حالانکہ وہ تو یہ
بھی نہ جانتی تھیں کہ ان کے ماضی کے اس راز سے ہم
چھوٹوں میں بھی کوئی واقف ہے۔ پھر بھی اندر ہی اندر
میں خاصی شرمندگی محسوس کر رہی تھی کہ یونہی بات
سے بات نکلنے میں میں کیا کچھ کھول گئی۔

کچھ ہی دیر بعد میری توجہ بٹ گئی اور اس کی وجہ گھر
میں ہونے والی وہ میٹنگ تھی جس میں تقریباً تمام ہی
بڑے شریک تھے۔ جیسے ہی عطا ان دونوں کو لے کر

اوتھک پہ نکلا، لیلیٰ آبی ہاسپٹل سدھاریں، کیشی، سیمہ اور حسنہ اسکول اور کلج شاداب اور کشف دونوں ایگزامز کی تیاری گھر بیٹھ کر کر رہی تھیں جبکہ میں نے اور بیلا نے شوقہ چھٹی ماری بھی صرف رحمہ بھی جو کلاس لینے گئی تھی۔ ایسے میں تجس کی ماری بیٹانے آ کر ہماری سونے کی تیاری پہ پانی پھیر دیا۔

”بتا ہے کیا ہوا؟“ اس نے کہا اور پھر یہ جانتے ہوئے کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں پوچھے گا کہ ”کیا ہوا؟“ خود ہی بول پڑی۔

”شبم چھو پھو نے صداقت علی کے لیے گل لیلیٰ آبی کا ہاتھ مانگا ہے۔“

”وہ تو صاف لگ رہا تھا کل یا پر سوں ایسا تو ہونا ہی تھا۔“ میں نے جمالی روکی۔

”لیکن ابو اور امی دونوں نے فوراً انکار کر دیا۔“

”وہ بھی ہونا ہی تھا ایسا تو کب سے ہوتا آ رہا ہے“ نبجانے یہ لیلیٰ آبی ایسا کر کے کے سزاوے رہی ہیں خود کو یا۔“

”ایک منہ۔ ایک منہ۔“ کچھ خیال آنے پہ میں بیلا کی بات کاٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ ”یہ فوراً انکار میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے پہلے ہر قابل ذکر رشتے پر بڑے ابو اور بڑی امی آبی کو قائل کرنے اور منانے کی ایک کوشش ضرور کرتے تھے چاہے ناکام ہی ہوں۔ پھر آخر شبم چھو پھو کے رشتے میں ایسی کیا قابل اعتراض بات ہے جو فوراً انکار ہو گیا۔“

”یہی۔ تو۔ اب بھلا پوچھو کیوں؟“ وہ ہم سب کا منہ تنگنے لگی، جبکہ دل ہی دل میں وجہ جاننے کے لیے بے تاب ہوتے ہوئے بھی ہم نے پوچھنے سے پرہیز کیا۔ اس سے زیادہ انتظار نہ ہوا خود ہی بتانے لگی۔

”دراصل پھو پھو کا انداز بہت عجیب سا تھا۔ زبان سے تو نہیں کہہ رہی تھیں کہ ان کی مرضی نہیں ہے لیکن بار بار جتنا ضرور رہی تھیں کہ یہ صداقت کا اپنا فیصلہ ہے اور یہ کہ گل لیلیٰ اپنی بچی ہے اور انہیں بے حد عزیز بھی پھر کیا ہوا اگر صداقت سے تین چار سال بڑی ہے تو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یعنی انہیں آبی اور اپنے بیٹے

کے درمیان موجود عمر کے فرق پہ اعتراض ہے جو چار سال کا ہرگز نہیں محض ڈیڑھ دو سال کا ہے جسے وہ خواستخواہ لبا کھینچ رہی تھیں۔ ابو نے ان کی بے دلی بھانپتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور انکار کے بعد جوان کے چہرے پہ اطمینان آیا، اس سے صاف ظاہر ہو گیا وہ صرف بیٹے کے کہنے پہ مجبور ہوئی تھیں۔“

”چلو جس کم جہاں پاک۔“ بیلا نے ہاتھ جھاڑے اور پھر سے تکیے پہ سر رکھ لیا۔ ”اب تو ابو اور چاچو کو اپنی بہن کی اصلیت کا پتہ چل گیا۔“

”ابھی کہاں۔“ بیٹانے بھنوس اچکا میں۔ ”ابو اور

بڑے بیلا کے خیال میں پھو پھو تھیک ہی سوچ رہی تھیں، عمر کا ذرا سا فرق بھی کچھ عرصے بعد خاصا نمایاں ہونے لگتا ہے۔ کسی نے اس بات کو ذرا بھی مائنڈ نہیں کیا۔ اسی لیے تو پھو پھو کی ہمت اتنی بڑھی کہ۔ انہوں نے فوراً ”ہی۔۔۔ بھلا بتاؤ۔ انہوں نے کیا کیا؟“ اس نے تجس کی لہر دوڑانے کی ناکام سی کوشش کی۔

”ہم کیا بتائیں، پردے کے پیچھے تم چھپی کھڑی تھیں نہ کہ ہم۔“ بیلا نے چڑ کر کہا۔

”چل۔۔۔ چل کب میں پردے کے پیچھے چھپی تھی میں تو لان میں کھلنے والی کھڑکی کے پیچھے۔ اچھا اب پوچھو بھی کہ کیا ہوا؟“

”اگر ہم نہ پوچھیں گے تو کیا آپ نہیں بتائیں گی بیٹا ڈیر!“ شاداب نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ہار مان کے وہ بتانے لگی۔

”شبم چھو پھو نے انکار کے بعد صداقت کا رشتہ ایک اور بھانجی کے لیے ڈال دیا ہے۔“ اب کے اس نے واقعی کھلبلی مچادی۔ شاداب، کشف دونوں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

”تو گویا انہوں نے باز ہرگز نہیں آتا۔ چودھری ہاؤس ہی سے کچھ نہ کچھ لے کر جاتا ہے۔“ بیلا تلملا کر بولی۔

”تو یہ تو ان کی محبت ہے کہ اتنی بڑے کاروبار جانیڈ اور لائق فائق بیٹوں کے ہوتے ہوئے وہ بھائیوں کا بوجھ ہلکا کر رہی ہیں، انہیں ایک سے ایک

اچھا رشتہ مل سکتا ہے لیکن انہوں نے اپنوں کو ترجیح دی۔" مینا خاصی متاثر تھی۔
 "تم تو سدا خود ترسی کا شکار رہی ہو۔" اسے چھوٹی بہن کی طرف سے طعنہ ملا۔
 "ہو نہ ہو۔ اب تو تم سب پوچھو گی بھی تو میں ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ اب کشنم پھوپھو نے کس کا نام لیا ہے۔ ہاتھ پیر جوڑو گی تو تب سوچا جائے گا۔" وہ اٹھ گئی۔

"ارے جاؤ منہ دھو رکھو ہاتھ پیر جوڑیں گے ہم؟" شاداب نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "ایسے ہی ترے بیٹھے ہیں نانا نام جاننے کے لیے۔"
 "اور اگر جاننا ہی ہو گا تو پردے کے پیچھے چھپنا کھڑکی کی اوٹ سے سنتا ہمیں بھی آتا ہے لیکن ہم اپنی یہ صلاحیتیں صرف وقت پڑنے پر استعمال کرتے ہیں۔" میں نے بھی لہو لگایا اور اسی وقت سے شاداب نے میری ڈیوٹی لگا دی گھر میں ہونے والی تمام تر تازہ ترین کارروائیوں کی رپورٹ لانے کی۔

اور سوئے اتفاق کہ جب سے میں نے بزرگانہ میٹنگز کی خبر خبر رکھنا شروع کی تب سے ہی یکے بعد دیگرے گھر میں اتنی تیزی سے نئے واقعات رونما ہونے لگے کہ میں خود حیران رہ گئی روز ایک نئی خبر اور انکشاف لیے میں ان چاروں کے رو برو ہوئی۔

اگلے دن میں نے بڑی امی کو فنیڈ آنٹی کے ساتھ سر جوڑے فکر مندی سے کچھ مشورہ کرتے دیکھا تو ٹپکتے ہوئے نامحسوس طریقے سے ان کے پیچھے لگے فش ایکو ریم کے پاس چلی گئی اور اس میں فش فوڈ ڈالنے ہوئے کان ان کی سمت لگا لیے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ اب صداقت علی صاحب کی سنجیدگی کی بھیجٹ کس کو چڑھایا جا رہا ہے۔ لیکن اس وقت موضوع گفتگو ہی اور تھا۔ بڑی امی رنے آپی کی ان کی سرال سے ناچاقی کے تذکرے بیان کر رہی تھیں۔

"وہ تو شکر ہے صفدر، ماں بہنوں کی الٹی سیدھی بچیوں میں نہیں آتا اور نہ رنے جاتی ہے، ان کا تو بس نہیں چلتا بیٹے کو بیوی کے پاس ایک منٹ نہ بیٹھنے

دیں۔" "نجانے کچھ عورتیں اتنی تسلط پسند کیوں ہوتی ہیں۔ ساری عمر وہ یہ حقیقت تسلیم کرنے سے گھبراتی ہیں کہ ان کا بیٹا کسی کا شوہر ہونے کے ناتے کچھ اور فرائض بھی رکھتا ہے۔" آنٹی نے افسوس سے سر ہلایا۔ "لیکن رنے نے یہ تو بتایا ہو گا کہ اس مسئلے کا حل کیا نکلا؟"

"میں نے بتایا تو ہے کہ صفدر سمجھ دار لڑکا ہے۔ گھر میں ہونے والی روز روز کی تلفیوں سے تنگ آکر اس نے الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے بلکہ رنے بتا رہی تھی کہ صفدر کا راولپنڈی پاکستان بسل ہونے کا ہے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ آپ کیوں اتنی فکر مند ہیں؟" "ارے فکر کیسے نہ کروں۔ اگر رنے کو سرال میں رہ کر سب اچھی بری سننے کا مشورہ دوں تو یہ اس کے ساتھ ظلم ہو گا۔ پردیس میں ویسے ہی لڑکی اکیلی ہو جاتی ہے، اوپر سے ایسی فتنہ ساس نندیں۔ اور اگر اس کا الگ گھر بسانے کا سوچتی ہوں تو گل بین کی فکر لگ جاتی ہے، اس کا رشتہ بھی تو اسی گھر میں طے ہے۔ ماں بیٹے کے رشتے کا کیا ہے، بیٹا الگ گھر بسا بھی لے تو ماں ناراضی کے باوجود اس سے تعلق تو نہیں توڑے گی لیکن بہو سے ساری عمر دل صاف نہیں رکھے گی، خواہ مخواہ کا بیر ماندھ لے گی۔ سب سے پہلے تو یہ رشتہ ٹوٹے گا۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے۔" فنیڈ آنٹی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن بھائی! ایک لحاظ سے مینا کے لیے اچھا ہی ہے۔ جب رنے جیسی سمجھ دار اور معاملہ فہم لڑکی ایسی سرال کو ہینڈل نہ کر سکی تو مینا تو پھر نا سمجھ ہے اور مزاجاً تیز بھی۔ اس کا گزارہ بھی مشکل سے ہی ہو گا اور یہ ضروری تو نہیں کہ صفدر کی طرح محمود بھی انصاف پسند شوہر ثابت ہو۔ ہو سکتا ہے اس میں اللہ کی کوئی مصلحت ہو۔"

"ہاں۔ بس اللہ کی مرضی کہہ کر دل کو تسلی دے لیتی ہوں۔ تمہارے بھائی صاحب بھی بالکل وہی کہتے ہیں جو تم کہہ رہی ہو لیکن یہ بھی تو دیکھو، رشتہ ملنا کتنا

مشکل ہے، لوٹنا تو آسان ہے۔ لیکن یہ تو ہاں باپ سے
 ضد باندھے، اس کا غم کم نہیں کہ اب گل بین کی
 طرف سے جو اطمینان تھا وہ بھی غارت ہو تا دکھائی دے
 رہا ہے۔ لوگوں کی بیٹیاں خاندان میں ہی کھپ جاتی
 ہیں۔ ہمارے تو دکھو لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ اماں جی صحیح
 کہتی تھیں بکریوں کا ریوڑ ہے اس گھر میں۔ دو سال
 مقلنی رہی سارے شہر کو پتہ ہے۔ بات ختم ہو جانے
 کے بعد، رشتہ مانا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ مسئلہ
 ہی مسئلہ ہے۔ مزید فراکتیں کیا جائیں، تمہارے بھائی
 صاحب نے تو کہہ دیا ہے کہ وہ گل بین کی طرف سے
 فکر مند نہ ہو اور بغیر کسی ذہنی دباؤ کے وہ فیصلہ کرے
 جس سے وہ اور اس کامیاب راضی ہوں۔ اب ہتاؤ بھلا
 صفدر کی ماں سے یہ توقع ہے رکھی جاسکتی ہے کہ وہ کوئی
 لحاظ، مروت قائم رکھے۔ یہ رشتہ تو اب ختم ہی
 سمجھو۔“

بڑی امی افسوس سے بات چلی رہی تھیں۔ وہ پچھلے
 دو سال سے بینا کی طرف سے بچتی بے فکر تھیں اب
 ان کی فکر میں ایک تازہ ترین فکر کا اضافہ مجھے
 اداس کر گیا۔ ان کی فکر سے دیکھا جائے تو یہ مسئلہ
 واقعی سنگین تھا خصوصاً ان کے لیے اس بات کا
 احساس شاید آئی کو بھی تھا اس لیے بجائے کوئی صلاح
 دینے کے وہ ان کے ہاتھ ہم رہی سے سمٹانے لگیں۔
 میں رشتہ بندھنے والی خوش نصیب کا نام جاننے کی
 امید لیے یہ جاسوسی کرتی پھر رہی تھی اور ہاتھ آئی تو
 رشتہ ٹوٹنے کی خبر۔ مایوس قدموں کے ساتھ پلٹ کر
 میں اوپر جانے کو تھی کہ اپنے پیچھے کھڑی بیٹا کو دیکھ کر
 جہاں کی تماں رہ گئی۔ اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ لبوں
 کی کپکپاہٹ اور آنکھوں کی جھلپاہٹ اتنی واضح تھی
 کہ اسے اپنا آپ چھپانے کے لیے اٹنے قدموں لوٹنا
 پڑا۔ میں دکھ سے اس سادہ سی لڑکی کے ڈولتے قدموں
 کی تھکن محسوس کرنے لگی۔

”کیا بیٹا محمود سے محبت کرنے لگی تھی؟“ سارا
 واقعہ سن کر رحمہ نے سوال کیا۔

”اس کی دیگرگوں حالت سے لگ تو ایسا ہی رہا تھا۔“
 میں نے قیاس ظاہر کیا۔

”ایسا لگ رہا تھا۔ یہ کہتے ہیں ہمیشہ لفظ آگے پیچھے
 کر دیتی ہو۔“ بیٹا اس موقع پر بھی میرے جملے کی تصحیح
 کرنے سے باز نہ آئی۔

”توبہ۔ ایک تم اور ایک وہ عطا۔“ اس کے ساتھ
 ہی مجھے یاد آیا کہ یہی جملہ ایک دو دن پہلے میں نے عطا
 سے بھی کہا تھا اور اس نے نجانے جواب میں ایسا کیا کہا
 تھا کہ ذہن الجھ سا گیا تھا۔

آخر کیا کہا تھا اس نے۔ اور کیوں کہا تھا۔ اچھا
 کیوں کو چھوڑو، یہ بعد کی بات ہے پہلے اتنا تو یاد آجائے
 ۔ اس نے کہا کیا تھا اور کہنے کے بعد اچانک چپ سا ہو
 کر فرار کیوں ہو گیا تھا۔

میں یاد کرنے لگی۔ اصل میں اس کا اچانک بات
 اور حوری چھوڑ کر سہما کے ساتھ بیٹہ منٹن کھیلنے چلا جانا
 ہی مجھے الجھا گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا وہ بے اختیاری
 میں کچھ کہہ دینے کے بعد چھپانے کی کوشش کر رہا
 ہے۔ اس کی اس حرکت نے میرے ذہن سے وہ بات
 بھی نکال دی اور اب بیٹا کے یاد دلانے پہ میں پھر ذہن پر
 زور دینے لگی۔

”محبت و محبت اس بے وقوف لڑکی کو کیا ہونی ہے“
 اسے صرف یہ دکھ ہے کہ اب وہ مقلنی شدہ نہیں رہے
 گی۔“ شاداب نے نتیجہ نکالا۔

”کسی حد تک تم ٹھیک ہو۔“ بیٹا نے تائید کی۔ ”وہ
 اس معاملے کو ویسے ہی لے رہی ہے جیسے امی۔ اسے
 بھی بات ٹوٹنے کی بدنامی، زمانے کے سوالوں کا ڈر اور
 مستقبل میں اچھا رشتہ نہ ملنے کا خوف لاحق ہے۔ اور
 کوئی بات نہیں۔ محبت کیا خاک کرے گی وہ نیک
 پروین۔ اسے میں سمجھا لوں گی۔“

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر ابھی محمود سے
 اچھا کوئی دوسرا پروپوزل اس کا آجائے تو ابھی گل بین
 چودھری جو کل سے کمرہ بند کیے ٹیکے میں منہ دے کر
 سسک رہی ہے، پورے گھر میں اچھل کود کر گاتی

پھرے گی۔“
سیون میرا ہی میرے بھاگ جگاؤں آگیا
میںوں ہیرناؤں آگیا

ہے دیا لیتی ہوں گی۔ تم ایک تو ویسے ہی نازک سے دل
والی اوپر سے ڈیڑھ پسی کی۔ تمہیں تو اس کینڈین
ساس نے چٹکی میں مسل دینا تھا۔“

اس نے بیٹا کے اچھے خاصے بھرے بھرے وجود کو
کمال ڈھٹائی سے ڈیڑھ پسی کا کہا کیونکہ وہ ہمیشہ خود کو
رحمان بان سا کہلاتا تھا۔
”لیکن یہ تو سوچو اب میرا بے گار کیا؟“

”تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تمہارا کیا بنے جا رہا
تھا، چٹنی، مرہ۔“ ہتھیلی پر نہیں بٹھا کے لے جائیں گے
وہ تمہیں۔ نہ ہی پلکوں پہ سجائیں گے اگر کسی نہ کسی
طرح ابو امی نے رخنے کے سسرال والوں کی فطرتیں
ترے کر کے انہیں رشتہ توڑنے سے باز رکھ بھی لیا تو
پھر تم ایسا کیوں چاہتی ہو۔ کیا فائدہ ماں باپ کا سر بھی ان
خیشوں کے آگے جھکے گا، تمہارا قدم بھی ہلکا پڑے گا اور
اس سب کے باوجود کوئی اچھی امید بھی نہیں مستقبل
کے بارے میں۔ یہ رشتہ ختم ہونے کی صورت میں کم
از کم مستقبل کے حوالے سے کوئی امید تو رکھی جاسکتی
ہے۔“

اس نے پھر سے سمجھانے کی کوشش کی۔ پتہ نہیں
چنا کبھی یا نہیں، لیکن چپ ضرور ہو گئی اور فی الوقت
اتنا بھی بہت تھا۔



وہ دن تو بیٹا کے معاملے میں الجھتے ہی گزر گیا۔ کوئی
کام کی بات نہ پتہ چل سکی۔ صداقت علی کی متوقع
”متاثرہ“ کے بارے میں اگلے دن سب مجھے پھر سے
اکسار ہی تھیں کہ میں اور کچھ سن گن لے کر آؤں۔
”اس سے تو بہتر ہے کہ بیٹا کے آگے ہی ہاتھ پیر جوڑ
کر اگلاؤ۔“ میں سخت بور ہو گئی تھی وہ ہی دن کی
جاسوسی ہے۔

”نہیں بالکل نہیں۔ آج کل اس کا سامنا کرنا بہت
خطرناک ہے پہلے تو ڈھائی گھنٹے اس کے دکھڑے سننا
پڑیں گے۔“ شاداب نے صاف انکار کر دیا۔
”ویسے بھی جان کر کرنا کیا ہے۔ میرا خیال ہے

”ہا۔ ہا۔“ رحمہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے
پھر سے نوٹس بنانے کے لیے فلم اٹھالیا۔ ”تو میں تو
سمجھی تھی کہ چودھری ہاؤس میں رہنا ہونے والی کسی
محبت بھری واردات کا تذکرہ ہو گا۔ لیکن نہیں جی۔
ایک بیٹا سے امید تھی کہ وہ کہیں دل لگا کر عاشقوں کی
فہرست میں نام لکھوائے گی، وہ بھی نہیں رہی۔ اور
کسی سے تو یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے۔ چودھری ہاؤس
کی بچیاں صرف تعلیمی میدان میں جھنڈے گاڑ سکتی
ہیں لیکن آپ کی طرح۔ یہ عشق و عاشقی کسی کے بس کی
بات نہیں۔“

میں کشف اور بیٹا ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں
اس روز میں ان دونوں کو آپ کے بارے میں بتا تو بیٹھی
بعد میں اتنا پچھتائی کہ قسمیں دے دے کر انہیں اس
راز کی پاسداری کرنے کا واسطہ دیا اسی لیے شاداب بیٹا
اور رحمہ ابھی تک ناواقف تھیں کہ چودھری ہاؤس
کی سب سے بڑی ”پکی“ نہ صرف تعلیمی میدان میں
اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ چکی ہے بلکہ محبت کی
چوٹ کھانے کے بعد اس کی ٹیسوں کو کسی تھنہ کی
طرح دل پہ سجائے بھی پھرتی ہے۔



”میں تو کہتی ہوں بیٹا! شکر ادا کرو کہ اس مودے ٹیم
پیس سے تمہاری جان خود بخود چھوٹ رہی ہے۔ ایمان
سے کسی طرح بھی تمہارے لائق نہیں لگتا تھا۔ کینڈا
کار بنے والا تو لگتا ہی نہ تھا، خانیوال جنگلشن کا سینئر فلی
نظر آتا تھا۔“

بیٹا نے غمگین بیٹھی بہن کو دلا سادینے کی نیت سے
بے چارے مودے کی مٹی پلید کی، لیکن اس پہ کوئی اثر نہ
ہوا۔

”رنے آپ کی کا حوصلہ ہے جو ایسی جلاؤ ساس کو
برداشت کرتی رہیں۔ پھر ان کی صحت بھی تو ماشاء اللہ

شاداب یا سحاب میں سے کوئی ہوگی۔ ان ہی کا نمبر آتا ہے، کشف بھی ہو سکتی ہے۔ ”رحمہ نے اطلاع دی۔“ اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں اصل نام ہی تو جانا ہے تاکہ کوئی فوری سدباب کیا جاسکے۔ ”بیلا نے اسے خوشگین نظروں سے گھورا“ اور ایک تم ہو سحاب ایک کام کہا ہے اور تم سے وہ بھی ڈھنگ سے نہ ہو سکا۔“

”مجھ سے پتہ چلتا لو۔ میں یوں بھی سخت بیزار ہوں۔ اتنے عرصے بعد عطا اتنے زیادہ دن رہنے آیا اور چاہوئے اسے صداقت شہادت کا گائیڈ بنا کر رکھ دیا۔ ذرا مزہ نہیں آ رہا ہے اس کے بغیر۔“

کشف اور رحمہ نے بھی تائید کی تو بیلا اطمینان ہو گیا۔ ”اوہ نہ تم لوگوں نے نبھائے کیوں اس بیڑے کو اتنا سرج چار کھاب ایک تو ہمارے گھر کا ماحول ویسے بھی مرنوں کی شان ہے نیازی اور اگر فوں کو چار چاند لگانے میں خاصا معاذن و مددگار ہے اور سے تمہاری وار دنیاں مزید سازگار ثابت ہو رہی ہیں۔“

”کیا تم سلیس انداز میں اپنا بیان دہراؤ گی۔“ کشف نے بے چاری سی من کر کہا۔

”مختصر یہ کہ اگر اسی طرح تم نے بے جا اہمیت دے دے کر عطا اللہ کا دماغ خراب کر دیا تو تم سب کا تو کچھ نہیں بگڑے گا اپنے اپنے گھروں میں عیش کر رہی ہو گی، سر پکڑ کر تودہ روئے کی شے چودھری بالوس کی اکلوتی بہو ہونے کا اعزاز حاصل ہو گا۔“

”بات سنو یہ تم نے ہم سب کو تو اپنے اپنے گھروں میں عیش کرنے کی نوید سنادی، اپنا پروگرام واضح کیوں نہیں کیا؟ کیا تمہارا ارادہ ساری عمر بڑی امی کے سینے پہ مونگ ولنے کا ہے۔“ میں نے کرید۔

”یہی سمجھ لو۔“

”خدا کا واسطہ ہے بیلا! اس کام کے لیے آپی ہیں نا۔“ کشف نے ہاتھ جوڑے۔

”وہیے آج تو عطا ان ”ہیکل اینڈ ہیکل“ کو لے کر کہیں نہیں گیا۔ بڑے والے صاحبزادے تو بیلا کے ساتھ فیکٹری وزٹ کرنے گئے ہیں اور چھوٹے والے

اسنو کر روم میں سیما اور کھٹی کے ساتھ ٹیم کھیل رہے ہیں۔ عطا موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پرانے فرینڈز سے ملنے گیا ہے۔“

”کیا کہا تم نے، چھوٹیاں اس زکوئے شجاعت کے ساتھ ہیں۔“ میں فوراً ”الرت ہو گئی۔“ حد ہوتی ہے لا پرواہی کی بھی۔ شاداب تم تو سمجھ دار ہو، تم نے انہیں اس کے ساتھ اکیلا کیوں چھوڑا اور بیلا تم۔ تم ویسے تو بڑی لیڈر بنی پھرتی ہو بچیوں کی، اتنا بھی نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ ان کے ساتھ زیادہ فری ہونے اور گھٹنے ملنے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا ہو گیا ہے سحاب بچیاں ہیں اور شجاعت۔ ہماری اپنی فیملی کا ہے۔ کزن ہے۔ ایسی بھی کیا تنگ نظری۔“ کشف نے برا سامنہ بنایا۔

”بچیاں؟ کھٹی فرسٹ ایئر میں ہے، منہ میٹرک میں۔ تم جب میٹرک میں تھیں اور سوئٹ سکھتیں میں تو سچ سچ بتاتا۔ سچی تھیں؟“ میں نے چمکتا ہوا سوال کیا جسے سن کر کشف سٹپٹا گئی اور پھر ہولے سے اٹنی میں سر ہلا دیا۔

”مالی ڈیر! یہی اتج تو خطرناک ہوتی ہے۔ ہر چمکتی چیز سونا محسوس ہوتی ہے۔ اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ ایسی نین ایجر لڑکیوں کو یہ فارن ریشن لڑکے بڑی جلدی الو بنا لیتے ہیں۔ رہی بات ان کے کزن ہونے یا اپنا ہونے کی تو رحمہ بی بی! آزاد اور بے باک فضاؤں میں ملنے والے رشتوں کی اس نزاکت اور پاکیزگی کو کیا جائیں۔ چلو اٹھو، آؤ میرے ساتھ، انہیں لے کر آتے ہیں اور سختی سے منع کرتے ہیں کہ آئندہ ان کے ساتھ اکیلے میں اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کشف کا ہاتھ پکڑا اور ہسٹل میں بے اسنو کر روم کی طرف چل پڑی۔

گولائی میں مڑتی میڑھیوں کے درمیان رک کر میں نے انگلی لبوں پہ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کان نیچے سے آتی آوازوں پہ لگا دیے۔ کائنات کی قل قل کرتی کمن ہسی کے ساتھ شجاعت کے بلند آہنگ قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ میں نے دانت

کچکاٹے ہوئے تصور میں ہی کبھی کے کان بھینچے۔
 "تم بہت بے وقوف ہو کائنات!" اس نے وہ
 کنٹ دیا جو وہ بچپن سے سنتی چلی آ رہی تھی اور ہر بار
 سننے کے بعد منہ پھلاکتی تھی۔

"اف شہی بھیا بھی کی کہتے ہیں۔"

"تو اور کیا کہوں تم باتیں ہی اتنی مزے کی کرتی ہو۔
 یہ تو بتاؤ تمہاری اتنی چالاک چالاک فرینڈز کے ساتھ
 کیسے نہ جاتی ہے۔ تم تو اتنی بھولی بھالی سی ہو اور جو
 قصے تم سنارہی ہو اسے سن کر اندازہ ہوتا ہے تمہارے
 گروپ کی لڑکیاں خاصی تیز ہیں۔ کتنی آسانی سے
 ٹیچرز کو قتل بنا لیتی ہیں۔"

"ٹیچرز کو تو کیا وہ اپنے ہر تمس کو بھی چھٹ کر لیتی
 ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ نموت نا اس کے
 دو دو بوائے فرینڈز ہیں۔ سارا ون فون پہ نیٹ پر ان
 سے فلرٹ کرتی رہتی ہے اور اس کے ہانا یا کو ذرا خیر
 نہیں ہوتی۔" اس کی اس اطلاع پر مسلسل ہنسنے
 شجاعت کے قہقہوں کو بریک لگ گئی۔ میں نے بھی
 کشف کے کان میں گھستے ہوئے دیا۔

"دیکھا موصوف کی چالاکی باتوں باتوں میں اس
 احمق کو کس موضوع پر لے آیا۔ بتاؤ کیا اعضا سے باتیں
 کرتے ہوئے وہ یہ راز آگل سکتی تھی۔ یہ فرق ہوتا ہے
 بھائی ہونے میں اور بھائی جیسا ہونے میں۔" وہ بھی
 سنجیدگی سے سر ہلانے لگی۔

"تمہاری فرینڈز کے اس قسم کے مشاغل بھی
 ہیں؟" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"سب کے تو نہیں، نمرو اور ورونیکا کو ہنسہ ہے
 آئے دن فرینڈز بدلنے کا۔ نمرو تو خیر فون اور نیٹ
 جنگ تک محدود رہتی ہے لیکن ورونیکا تو اکثر ان
 کے ساتھ گھومنے پھرنے بھی چلی جاتی ہے۔ اس کی
 فیملی بھی زیادہ کنزرویٹو نہیں شاید اس لیے۔"
 "اور تمہاری فیملی؟"

"میری۔۔؟ اف تو یہ۔" اس نے جھرجھری لی۔
 "ہمارے گھر میں سب کے سامنے تو کیا چھپ کر بھی
 ایسا کوئی کام کرنا مشکل ہے۔ آپ، رنے آپ، بجیا، اپا

سب کالج یونیورسٹی جاتی رہیں لیکن مجال ہے کہ گھر
 کے اصولوں کے خلاف ذرا سا بھی قدم اٹھاتیں۔ میری
 می کا تو آپ کو پتہ ہے، قارنر ہیں لیکن بڑی امی جیسی ہی
 سخت ہیں بیٹیوں کے معاملے میں نمرو کی ماما کو پرواہی
 نہیں ہوتی، چاہے وہ گھنٹوں فون سے چپکی رہے۔"

"جب تمہارے اور ان کے گھروں کے ماحول میں
 اور تمہاری اور ان کی عادتوں میں اتنا فرق ہے تو پھر اس
 دوستی کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔"

"جی؟ کیا مطلب شہی بھیا؟"

"بیٹا! اگر تم سچ سچ مجھے بھیا سمجھتی ہو تو پھر میرا ایک
 مشورہ مانو۔ پہلی فرصت میں اپنی مہینہ چھیج کرو۔"

تمہارے جیسی پیاری سی معصوم سی اچھے اچھے خیالوں
 والی بچی کے ساتھ ایسی دلچسپیاں رکھنے والی فرینڈز سوٹ
 نہیں کرتیں۔ کیا تمہیں پہلے کسی نے نہیں سمجھایا۔"

"میں نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں ان کے بارے
 میں۔ مجھے بھی ڈر تھا کہ سب سے ڈانٹ پڑے گی آپ
 بھیا کے ساتھ ساتھ میرے دوست بھی بنے تو آپ کو
 بتا دیا لیکن آپ نے بھی یہی بات کی۔" وہ غلطی سے
 بولی۔

"اس لیے کہ دوست وہی اچھا ہوتا ہے جو غلط
 کاموں کی نشاندہی کرے اور درست راستے پر قدم
 اٹھانے کی ترغیب دے اور میں تو صرف دوست ہی
 نہیں، بھیا بھی ہوں تمہارا پھر کیسے نہ تمہیں ٹوکتا۔"

"لیکن بھیا! نمرو اور ورونیکا دونوں بہت اچھی
 لڑکیاں ہیں۔ وہ جو کچھ کرتی ہیں مجھے اس سے کیا؟ کوئی
 مجھے تھوڑا سا ساتھ چلنے کو کہتی ہیں۔" اس نے فرینڈز کی
 وکالت کی۔

"آج نہیں کہتیں لیکن جیسے تم ابھی ان کی غلط
 روش کو غلط سمجھنے پر تیار نہیں، اسی طرح رفتہ رفتہ
 تمہیں اس کھیل میں جھکنا محسوس ہونے لگے گی پھر
 تمہیں ان کا اپنی فیملی کو چھٹ کرنا بھی برا نہیں لگے گا۔"

برائی بہت جلدی اثر لیکٹ کرتی ہے میری گڑیا۔" اس
 کے لہجے میں اتنی شفقت اور فکر مندی تھی کہ میں
 اپنے کچھ دیر پہلے والے خیالات پہ نادام ہو گئی۔

”بھیا آپ۔ آپ تو فارن سے آئے ہیں۔ پھر بھی
پھر بھی۔“ وہ شاید اپنے اس کزن کو بہت روشن خیال
سمجھ بیٹھی تھی۔

”ہاں۔ وہاں یہ سب بہت عام ہے اور برا بھی
نہیں سمجھا جاتا لیکن روزگار کے سلسلے میں کسی پرانی
مٹی پہ جا بسنا اور بات ہے اور پرانی ریتوں کو گلے سے لگا
لینا دوسری بات ہے۔ میری کوئی سگی بہن نہیں لیکن
اگر ہوتی تو میں اسے ایسے ہی گائیڈ کرتا جیسے تمہیں کر
رہا ہوں۔ ایک مادر پدر آزادو معاشرے میں رہنے
والے مسلمان شخص سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے
کہ وہ اپنی شناخت بھی کھو دے گا۔ ہاں ایسا ہوتا ہے
کہیں کہیں۔ اور پاکستان میں بھی میں نے کئی ایک حد
سے زیادہ آزاد خیال، پندار و بھی میں لیکن میری امی
کی تربیت یہ نہیں تھی انہوں نے ہمیں ہماری
روایات سے کٹنے نہیں دیا۔ یہاں اس گھر میں آکر
سب کچھ بہت اپنا اپنا سا لگا دیا ایسی سیسا امی بتاتی تھیں
ایسے میں کوئی بھی ایسی بات ڈسٹرب کر دیتی ہے جو اس
اجنبی دیار کی یاد دلاوے۔“

”سورجی بھیا! میں نے انجانے میں آپ کو ڈسٹرب
کیا۔“

”اؤ نو۔ ایسی بات نہیں میں بس ذرا فکر مند ہو گیا
تھا۔ تم اتنی انویسٹ ہو تا اس لیے۔ پراس کرو کہ
آئندہ فرینڈز بنانے میں محتاط رہو گی۔“
”پراس بھیا۔!“

اور میں کشف کے ساتھ اٹے قدموں اوپر لوٹ
گئی۔

”یار!۔۔۔ شبنمی۔۔۔ میرا مطلب ہے شجاعت تو بڑا
ٹھیک ٹھاک بندہ نکلا۔“ کشف مجھ سے زیادہ متاثر
تھی۔

”ہوں۔“ میں خجالت کی وجہ سے کھل کر تسلیم بھی
نہ کر سکی۔

”برامت ماننا“ تم بیلا اور شاداب کی صحبت میں رہ رہ
کر خود بھی خاصی شکی مزاج اور انتہا پسندانہ سوچ رکھنے
لگی ہو۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن کیا کروں
شاداب، میری بہن ہے تو بیلا میری دوست، کچھ اثر تو
آتا ہی ہے۔“

”تو اچھے اثر لو ناں میری جان! تم نے شاداب کی
منفی نقطہ نظر رکھنے والی سوچ اپنائی۔ اس کی تعلیم کے
بارے میں سنجیدگی سے متاثر نہیں ہوئی۔ تم سے
آگے سیما ب نکل رہی ہے۔ اسی طرح بیلا کی
جذباتیت تم میں دن بدن پروان چڑھ رہی ہے لیکن اس
کے جیسی پھرتی اور دوسروں کے کام بڑھ بڑھ کر کرنے
کی عادت تمہیں چھو کر نہیں گزری۔“

”اچھا اب تم میرے بچے ادھیڑنا بند کرو۔ ایسا بھی کیا
کر لیا میں نے ذرا وہ تمہارے سببی میاں کی شان میں
گستاخی کیا ہو گئی کہ۔“

”اے اے آرام سے۔ تمہارا ہو گا وہ شبنمی
میاں۔“ کشف نے میرے زور کی دھپ لگائی، ہم
دونوں لڑتی جھگڑتی اندر داخل ہوئیں تو کمرے کا سنجیدہ
ماحول معنی خیز تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟ بیلا کہاں گئی؟“
”اے بڑی امی نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔“
رحمہ نے اطلاع دی۔

”اور وہاں آنٹی فیصلہ اور آنٹی رابعہ پہلے سے
موجود ہیں۔“ شاداب نے اضافہ کیا۔ میرے کان
کھڑے ہو گئے۔

”نہیں۔ تو کیا۔۔۔ کہیں وہ متوقع لڑکی بیلا ہی تو
نہیں۔؟“

”شاید۔“ کورس میں جواب ملا۔ میں نے بیلا کے
بتائے راستے پہ چلتے ہوئے لان کی راہ لی جہاں نچلے
پورشن کے تقریباً ہر کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی۔

”کیا۔۔۔ گل لہلی آپی کے بعد انہوں نے میرا نام لیا
اور آپ نے چیپ چاپ سن لیا۔؟“ بیلا اندر چلا
رہی تھی۔ ”منہ توڑ جواب کیوں نہ دیا۔؟“

”آئے ہائے کیسا منہ توڑ جواب انہوں نے رشتہ
ڈالا ہے کوئی اینٹ تو نہیں دے ماری جو میں جو لیا“ پتھر
اٹھا کر مارتی۔ ”بڑی امی بگڑ کر بولیں۔“

چوہری ہاؤس سے نہیں نکلوں گی۔“

”تجھے تو میں بتاتی ہوں۔“ اور اس سے پہلے کہ بڑی امی ٹھیکہ فارسی گالیوں پہ اترتے ہوئے اس کی باقاعدہ مرمت شروع کرتیں، رابعہ آنٹی نے دخل دیا۔

”شیریں بھالی! پلیز آج اس بات کو رہنے دیں۔ پھر کسی وقت میں خود آرام سے گل بیلا کو سمجھاؤں گی۔ یہ کوئی طریقہ نہیں جو ان بیٹیوں سے بات کرنے کا۔“

”اور اس کا طریقہ دیکھ رہی ہوں رابعہ! کیسے زبان چلا رہی ہے ماں کے آگے ارے ان کر تو توں کے ساتھ تو میں ویسے بھی ایک منٹ گھر میں پروا نہ کروں اور یہ ساری عمر یہاں رہنے کی دھمکی دے رہی ہے۔“

ان کا ارادہ اب دوڑنے سے منہ ڈھانپ کر رونے کا تھا۔ بیلا کسی جذباتی لمحے کی زد میں آکر کمزور پڑنے کے خوف سے وہاں سے کھسک لی۔

”اگلا آج تو بہت تھک گیا ہوں۔ یار بہت واک کرنا پڑی۔ آج ایسی ایسی قدم پر تھج گلیاں گھما کے لایا ہوں ان کو جہاں گاڑی تو کیا، سائیکل کا جانا بھی دشوار تھا۔“ عطا نے صوفے پہ ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

شجاعت کا بھی یہی حال تھا جبکہ صداقت و عاسلام کے بعد اپنا کیمرا سنبھالتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”گھانا لگو اؤں۔“ فنیلہ آنٹی، جو ان تینوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں، انہوں نے جلدی سے اپنا آخری کام نمٹانے کا سوچا۔

”نہیں بالکل گنجائش نہیں۔“ وہ پیٹ پہ ہاتھ پھیرنے لگا پھر کچھ خیال آنے پر شجاعت کو دیکھ کر بولا۔

”سچی سے پوچھ لیجئے۔“

”نہیں آنٹی! افطاری میں ہی اتنا کچھ لے لیا۔ اس کے بعد پھر زبردستی عطا نے دوبارہ ٹھنڈا دیا۔ اب تو سحری تک کی جگہ مشکل سے نکلے گی ہاں البتہ تم وہ چلے گا۔“

”اور میرے لیے چائے۔“

”ابھی بناتی ہوں۔“

”اچھا اور وہ جوانوں نے آلی اور اپنے سپوت کے بارے میں کہا تھا کہ عمر کا دو سال کا فرق بھی خاصا نمایاں ہونے لگتا ہے تو اب اس کے اور میری عمر کے درمیان موجود آٹھ نو سال کا فرق نظر نہیں آیا۔ سن لیجئے میں نہیں کرنے والی اس عینک والے جن سے شادی۔“

میں نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔ یہ دوسری صرف گل بیلا چہ دوسری کا ہی خاصا تھی۔

”اے لو وہ بڑے کا نہیں چھوٹے کا رشتہ ڈال رہی ہے تمہارے لیے۔“ بڑی امی کی اطلاع پہ وہ نئے کمرے سے بھڑک اٹھی۔

”وہ قباچہ۔ جس کی باجیس ہر وقت چری رہتی ہیں“

لو تھ پیٹ کا اشتہار۔ بلکہ، نوٹف کانٹریڈ مارک۔“

”بڑی بات بنا! یوں نہیں کہتے کوئی ڈھنگ کا اعتراض ہو تو کہو، فضول میں کیڑے مت نکالو۔“ رابعہ آنٹی نے ٹوکا جبکہ فنیلہ آنٹی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

”ڈھنگ کا اعتراض۔ ہاں وہ مجھے تگے پڑھنا ہے۔“

”چھی بات ہے، شبنم آپ کو خود بھی خواہش ہے اور شجاعت بھی بڑی لکھی بیوی چاہتا ہے آرام سے وہاں بتنا دل چاہے بڑھتی رہتا۔“ آنٹی نے تسلی دی۔

”کل۔ لیکن میں یہاں پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں جانے والی ساوتھ افریقہ۔“ وہ ڈھنگائی سے کندھے بدلتی۔

”تیرا تو باپ بھی جائے گا۔“ بڑی امی کا افغانی خون جوش مارنے لگا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے انہیں بھیج دیجئے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”اور تیرا کیا اچار ڈالوں، بت بنا کر اہداری میں نصب کروالوں۔“

”مجمول چاہے کیجئے مگر میں یہاں سے ملنے والی نہیں۔ سب سن۔ لیجئے میں ہرگز ہرگز جیتے جی

”ارے آپ کیوں؟ یہ بکریاں ہیں نا۔“ اور میں جو اس کے کہنے سے پہلے ہی خنجر سے اپنی کوا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ رہی تھی، دھب سے بیٹھ گئی یہ جملہ سنتے ہی۔ شاداب نے بھی اس کے کان چھپے۔ وہ ڈیڑھ سال کی بڑائی کا فائدہ اکثر بونسی اٹھایا کرتی۔

”عطی بھیا! کیا آج آپ لوگ پرانے پرانے محلوں میں گئے تھے؟“ کائنات اور سیماب نے روز کی طرح تقفیش کا آغاز کر دیا۔

”ہاں اندرون شہر بھی۔ اور اس کے علاوہ چند تاریخی مقامات بھی دیکھے۔ آج پہلے تو چوہر جی گئے پھر ان دونوں کو شالامار باغ کھما کے لایا۔ واہ واہ کیا حسن تھا۔ کیا نظارے تھے۔“

اس کے عیش عیش کرنے پر شبنم کھی کھی کھی کرنے لگا تو میں سمجھ گئی کہ یہ کس قسم کے نظاروں کی بات ہو رہی ہے۔

”پراندے والے نظارے؟“ میں نے کریدا۔
”اُں۔ آہم۔ ہاں ہاں دینی۔ رانی بانو، ہینو، چینیو، شاداب، اینٹیاں۔ ایک سے ایک حینہ کد کڑے لگائی پھر رہی تھی۔ کھلی کلیہ دی۔ پیک میرے ویری دی۔ اور یار مصحفی! وہ کون سا لیت تھا جو پینگ (جھولا) جھولتے ہوئے وہ کوٹے والا سوٹ پہنے لڑکی گنگنا رہی تھی۔؟“

”گنگنا نہیں رہی تھی اچھا رہی تھی۔“ شجاعت نے تصحیح کی۔

”ہاں یار واقعی ایسا لگ رہا تھا جیسے گانا نہیں گا رہی، چھ کا ہماڑہ یاد کر رہی ہے زور لگا لگا کر۔ خصوصاً جب جھولا آگے کی طرف اوپر کو لے جاتی تو خوب لمبا کھینچ کر ”دل لے جائی جی ہاں کر کے۔“ الاپتی اور پھر نیچے کو آتے ہوئے ”گورے رنگ تے دوپٹیاں دی چھاں کر کے مکمل کرتی۔“

”نزی گپ۔“ کشف نے ماننے سے انکار کر دیا۔
”ہم لوگ گئے تو تھے ایک بار، بنوں والے فننگ برقعوں میں پھر رہی تھیں ساری لڑکیاں، نقاب کے اندر ہاتھ ڈال ڈال کر قلفی چوس رہی تھیں اور گول گپے

بھی نقاب کے اندر ہی کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ تمہیں یہ اٹھ بیاریں کہاں سے لکھا گئیں۔“

”بس خدا جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ گور نمٹ کر لڑکائی مانگا منڈی سے بس بھر کے پٹنگ منانے آئی تھی۔“

”روزوں میں؟“ میں ابھی بھی مشکوک تھی۔

”ہاں تو کیا ہم روزوں میں نہیں سیر کرتے پھر رہے۔“

پتہ ہے پھر اس کے بعد ہم میلے گئے۔ وہاں قریب ہی لگا تھا جہاں میلہ چرائیاں لگتا ہے۔ ڈھول کی تھاپ یہ

بھنگڑا ڈالتے ہوئے صداقت سے موسوی بھی بنوا لئی۔

اڑن کھنولے پہ بھی بیٹھے اور یہ اڑن کھنولا جو اے لینڈ

والا سیف اینڈ ساؤنڈ قسم کا نہیں تھا، چاروں طرف سے

جالی کی دیواروں اور چھت والا، بلکہ اوپن ایر تھا۔ اتنے

میں افطاری کا وقت ہو گیا۔ ستو کے شربت، بیسن کے

قندے اور گلگلوں کے ساتھ روزہ کھولا۔ بھائی، موچی اور

لکشمی سارے گیٹ دکھاتا پھرا نہیں تبھی کے پائے کا

ڈنر کرا تا گھرا رہا ہوں۔“

”ہاں وہاں جانا بھی تو بہت ضروری تھا آخر اتنے

اچھے ڈنر کے بعد ورائٹی پروگرام بھی تو دکھانا ہو گا۔“

بیلا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس کی ٹانگ کھینچی۔

”نہیں بھئی، ہمارا کلچر یہاں تک تھا وہ میں نے دکھا

دیا، یوں بھی چاچو نے مہمانوں کو کلچر دکھانے کا کہا تھا

”کیچر“ دکھانے کا نہیں۔“ اس نے بڑے پتے کی بات

کی۔ شجاعت اپنی والدہ محترمہ کی قدم بوسی کے لیے

اندر کی طرف لپکا تو بیلا نے پھر سے شرم دلائی۔

”دیکھو، یہ حال ہے ان باہر سے آنے والوں کا اور

ایک یہ اپنا لوکل لاڈلا ہے جسے اتنی توفیق نہیں کہ اپنی

رنگ رلیوں کی داستان سنانے کے بجائے اندر جا کر

اپنی ماما کو اپنا تھوڑا دکھا آئے، سلام کر آئے۔ وہ بے

چاری ڈھنگ سے افطاری بھی نہ کر پائیں کہ نچانے

ان کا لاڈلا کیا زہر مار کر رہا ہو گا حالانکہ سب نے یقین

دلایا کہ ان کے لاڈلے کی جیسیں بھاری رقعوں سے

لٹکی رہتی ہیں اور ہر شہر کے ہر چھوٹے بڑے ڈھابے پہ

اس کا کھانا کھلا رہتا ہے۔“

”مجھے تمہارے اس اشتعال انگیز بیان میں صرف ایک بات یہ اعتراض ہے اور وہ یہ کہ تم نے میری بے ضروری، شریفانہ سی اور کسی حد تک چنڈوانہ سی سرگرمیوں کو رنگ رلیاں کس نقطہ نظر سے قرار دیا ہے۔ کیا تمہیں رنگ رلیاں منانے کا مطلب پتا ہے۔“ آخری جملہ اس نے ذرا جھک کر شرارت سے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔

”مجھے تو صرف یہ پتا ہے کہ تم رنگ رلیاں، عیاشیاں، من بانیوں، سرکشوں سب کچھ کرنا فوراً کر سکتے ہو کیونکہ تم چودھری ہاؤس کی بے زبان بے ضرور بکری نہیں بلکہ سانڈ ہو۔“ اس نے بڑی امی کی طرف سے ڈالے جانے والے دباؤ اور جواب میں اپنی بے بس ناراضی کا سارا اثر پر نشن اس پر اندھا کیا۔

”ہیں۔ ہیں؟ سانڈ اور میں۔؟“

وہ اس کے لال بھو کا چہرے کو حیرت سے دیکھتے لگا۔ بے چارے کی کچھ سے باہر تھا کہ آج شام مار میں میر کرنے کیلئے میں بھنگوا ہال کر سٹو کا شریعت پیئے اور شادی منلے کے چکواڑے سے اپنے کھانے سے دو سانڈ کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے اور یہ کہ آخر اس سے ایسا کیا قصور سرزد ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں اس کی یہ کرن یوں تھپتھپ سے اکھڑ گئی ہے جو پہلے بھی خاصی اکھڑی رہتی تھی اس کی تمام تر وہ ستانہ اور مخلصانہ کاوشوں کے باوجود۔ ہم سب بیلا کی شجیدگی کے باوجود ہنس پڑیں۔

”خدا ادب لڑکی! تم جانتی ہو تم کس سے مخاطب ہو؟“ اس نے جھوٹ موٹ آنکھیں نکالیں۔ وہ بیلا کی فرسٹریشن سے بے خبر اسے اس کا بلکا چھٹکانداق اور پھینر چھاڑ ہی سمجھ رہا تھا۔

”ہاں ہاں پتا ہے۔ کیا ہو تم؟ کیا ہے تم میں؟ کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ مجھے تو کوئے کا پر بھی نظر نہیں آتا۔ صرف یہی ایک خوبی ہے تم میں کہ تم ایک مرد ہو۔ اس بات کا زعم ہے تو میں اسے خولی ماننے سے انکاری ہوں۔ یہ کون سا بڑی بات ہے۔ تم کوئی زمانے

بھر کے اکیلے مرد ہو۔ کروڑوں، اربوں، کھربوں مردوں رہے ہیں دنیا میں ہاں تمہیں ضرور ایک خاص اسٹینڈس حاصل ہے وہ اس لیے کہ چودھری ہاؤس میں پیدا ہو کر ضرور تم نمبر بنائے ہو۔ لیکن سوچو تو اس میں بھی تمہارا کوئی کمال نہیں۔ تمہاری یہ اہمیت بھی ہم بکریوں کی مرہون منت ہے۔ اگر جو تم سے پہلے شاداب رتنے آئی اور لیلی آئی کے بجائے امان اللہ، مہرا اللہ اور شاد اللہ پیدا ہو گئے ہوتے تو تمہاری پیدائش یہ دو اتین دن و آتا دربار پر دیکھیں نہ چڑھتے اور دادو شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد یتیم خانے میں کپڑے نہ بھجواتیں اور جو عطاء اللہ چودھری کے بعد بیلا، بیلا، کیٹی، سیمہ، رحمد اور حسنہ کے بجائے بیلو، پو، ٹیپو لائن بنا کر آجاتے تو تمہاری کیا ویلیو ہوتی، تمہیں کون پوچھتا۔“

”بس بھی کرو، یہ سانڈ کیا تمہاری سب (ہینس) بھگا لے گیا ہے جو بے چارے کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔“

وہ بے چارہ تو چپ چاپ اس کے غضبناک چہرے کو ٹٹک رہا تھا۔ یہی ترس کھا کر دھل دیا۔ دوسری طرف قبوے کی خوشبو آتے ہی شجاعت کمرے سے برآمد ہوا تو بیلا ڈیبا کی آنکھیں چراتے ہوئے وہاں سے نکلی گئی۔ عطا پر سوچ انداز میں اس کی جانب تکتا رہا۔ شجاعت فی دی پر اپنا مودی کیمرہ سیٹ کرتے ہوئے کائنات اور حسنہ کو آج دیکھی گئی تاریخی عمارتوں کو ویڈیو دکھانے لگا۔ عطا نے جیکے سے مجھ سے پوچھا۔

”ہوا کیا ہے؟“ میں نے ایک نظر شاداب کو دیکھا پھر اسے بتانے لگی۔

”اڑتی اڑتی سنی ہے کہ شبنم پھوپھو نے بڑے بیٹے کے دل کی صورت حال واضح نہ ہو سکنے کی صورت میں فی الحال چھوٹے کا بندوبست کرنے کا سوچتے ہوئے بیلا کا نام لے لیا ہے۔“

وہ یوں بدک کر اچھلا جیسے سانپ نے ڈنک مار دیا ہو۔ اڑے اڑے چہرے کے ساتھ پہلے مجھے پھر کائنات سے خوش گپیاں لگاتے شجاعت کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے عجیب سے تھے کہ

میں نے شاداب کو ٹوکا دیا لیکن وہ صوفے پر ہی دراز ہو کر اونگھنے میں مشغول ہو گئی تھی۔ دوبارہ سے اس کی طرف توجہ دی تو وہ آنکھیں موندے چہرے پہ ایک بازو موڑ کر رکھتے ہوئے صوفے کی بیک سے سر نکا کر بیٹھا تھا۔

”اور۔ اور بیلا کیا کہتی ہے؟“ چہرہ تو چھپ ہی چکا تھا، آواز بھی خاصی سپاٹ سی تھی۔

”کہنا کیا ہے؟“ تم تو جانتے ہو وہ چھو پھو کے آنے سے پہلے ہی ان سے خار کھائے بیٹھتی تھی، اسے یوں گھر آکر لائسن میں لڑکیاں کھڑی کر کے چھائی کرنے کا طریقہ کار کچھ پسند نہیں آیا بلکہ اسے تو سرے سے یہ فضولیات پسند ہی نہیں۔ یہی مسئلہ بیلا وہ غیر وہ غیر اس کے نزدیک تو یہ فضولیات ہی ہیں۔ ماش کے آنے کی طرح اینٹھ گئی ہے کہ ہرگز اس ڈنٹونک کے نزدیک مارک سے شادی نہیں کرے گی لیکن بڑے ابو اور بڑی امی سمیت باقی بڑے بھی تقریباً راضی ہیں اس رشتے پر بڑی امی یوں بھی لیلیٰ آپلی کے مسلسل انکار اور اب جیٹا کی منتفی کے ڈانٹوں ڈول ہونے سے پریشان تھیں، لیکن کے لیے تو یہ رشتہ نعمت ہے۔ راجہ آئی۔ ”نہیں آئی سمیت بڑے بیلا اور بیلا کسی کو بھی اعتراض نہیں۔“ میں نے آہستہ آواز میں اسے ساری رپورٹ دی۔

”میں نے پوچھا۔ بیلا کیا کہتی ہے؟“ اس بار اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی کچھ بھی کر لے وہ چودھری باؤس سے نکلنے والی نہیں۔ مرتے مر جائے گی۔ مگر اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔“

میں نے اس کے الفاظ دہرا دیے۔ عطا ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر ہشاش بشاش تھا۔ بیلا کے کچھ دیر پہلے کے تھے جملوں کا تھکا تھکا اثر اس کے چہرے سے غائب تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں کے گوشوں اور آنکھوں کی پتلیوں پر تھکر رہی تھی۔

پورے گھر میں صبح سے ہی ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص پر جوش سا تھا اور کیوں نہ ہو۔ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

بڑی امی کے ہاتھ پیر مارے خوشی اور لو کھلا ہٹ کے پھولے جا رہے تھے۔ ان کا گول گول سفید چکنا چروچ سچ قد حار کے انار کی طرح لال لال تھا۔ بڑے ابو آج گھر سے نکلنے پر تیار ہی نہ تھے۔ بیلا انہیں مشکل سے ساتھ لے جانے پہ کامیاب ہوئے کہ آج ایک ضروری میٹنگ تھی اور ان کا وہاں ہونا لازمی تھا جبکہ بڑے ابو کے خیال میں آج ان کا گھر پہ ہونا زیادہ ضروری ہے کیونکہ گھر پہ ہونے والی میٹنگ زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ تب بڑی امی نے بتایا کہ اس میٹنگ کے شروع ہونے میں ابھی کئی گھنٹے ہیں اور آپ تو عصر تک آئی جائیں گے۔

البتہ چھٹیاں کرنے کے شوقین حبیب اللہ چاچو خوب جوش و خروش کے ساتھ تمام خواتین کی مدد کر رہے تھے۔ مارکیٹ سے پھل اور گوشت لانے میں بھی اور ڈرائنگ روم کی ازسرنو آرائش کے سلسلے میں رائے دینے میں بھی۔ راجہ آئی نے کیک بیک کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ فنیڈ آئی کے ذمے بریانی اور نرم گسی کوفتے تھے۔ افغانی تکے اور چیلی کباب بنانا تو ہمیشہ سے ہی بڑی امی کی ڈیوٹی تھی۔ افطاری کے لوازمات کی ذمہ داری بیلا، شاداب نے انہیں خوشی بانٹ لی تھی اور میں نے سوٹ ڈش کا ٹھیکا لے رکھا تھا بقول عطا کے اور جس کے لیے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں وہ ہستی گھر پہ موجود نہ تھی۔ حالانکہ میں نے اور کشف نے لیلیٰ آپلی کو لاکھ روکنے کی کوشش کی کہ کم از کم آج تو گھر پہ رگ جائیں کیونکہ ایک بار گھر سے نکلنے کے بعد وہ وعدہ کرنے کے باوجود کبھی جلدی گھر نہیں آئیں۔ نہ انہیں ہاسپٹل سے ہاف ڈے لینے کی عادت تھی نہ ہی شام کو فری کلبنگ پہ بیٹھنے کا ناغہ کرنا پسند تھا۔

نا پسند تو انہیں اور بھی بہت کچھ تھا، اپنے ارادوں سے پیچھے ہٹنا، اپنے کئے الفاظ واپس لینا اور اپنی قسم

انہیں دینے پہ تیار ہوئی ہوں یہ کہہ کر کہ بعد کے حالات کی ذمہ داری میری نہیں۔ آپ سے صرف اتنی ہی التجا ہے کہ انکار ہی کرنا ہو تو خدا را سلیقے سے کیجیے گا اور ہاں۔ اس بار وہ اکیلی نہیں ہوں گی، ڈاکٹر عمر کی چار سالہ بیٹی بھی ہمراہ ہوگی۔

اتنا کہہ کر وہ تو کمرے میں بند ہو گئیں۔ بڑی امی کو پسوڑی (افرا تفری) پڑ گئی۔ پہلے تو وہ خود کو یہ یقین ہی نہیں دلا پار ہی تھیں کہ ان کے کانوں نے کیا سنا ہے۔ پاس بیٹھی بیٹا نے کندھے سے ہنسنے لگا کر کہاں کو ساری بات پھر سے بتائی کئی روز سے اس پہ چھائی سوگواری اڑن چھو ہو چکی تھی۔ بیٹا نے بھی منت کی۔

”امی، پلیز اس بار نہیں۔ اب نہیں۔۔۔ بہت ہو چکا۔“

اس نے ماں کے ٹھنڈے ٹھار ہاتھ تھام کے التجا کی۔ بڑی امی کے ہوائیاں اڑے چہرے پہ رفتہ رفتہ بہتری کے آثار نمودار ہوئے اور دل ہی دل میں ایک پکا عزم کرتے ہوئے وہ شوہر نامدار سے بات کرنے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس موقع پہ انہوں نے دیور اور دیورانیوں کے ساتھ ساتھ نند کو بھی اعتماد میں لینا ضروری سمجھا۔ سب بچپائی اپنی اس بھیجی کے انکار اور ناراضگی کے پس منظر سے آگاہ تھے لیکن شبنم پھوپھو کے لیے یہ خبر نئی تھی۔ وہ تاسف سے کتنی ہی دیر تک سر ہلاتی رہیں۔

”اباجی اور اماں جی دونوں پرانے زمانے کے لوگ تھے۔ پرانی سوچوں پرانے رواجوں کو گلے سے لگا کر جینے والے لیکن بھائی جان آخر تھے تو وہ آپ کے والدین ہی۔۔۔ اولاد اور اولاد کی اولاد سے محبت ان کے اندر بھری پڑی تھی۔ آپ سب تو نئی سوچ رکھنے والے تھے مگر سب مل کر سمجھاتے بیٹی کے لیے اسٹینڈ لیتے تو وہ مان ہی جاتے۔ چلو اگر کچھ ناراض بھی ہوتے تو کیا تھا۔ کیوں نعمت بھائی جان! آپ نے رابعہ بھالی سے چوری چھپے شادی رچائی تو کیا وہ خفا نہیں ہوئے تھے مگر کتنا عرصہ؟ اسی طرح مجھے یاد ہے وہ فضیلا کے لیے بھی راضی نہیں تھیں لیکن رابعہ اور آپ سب کو

توڑنا، لیکن بھلا ہو ڈاکٹر عمر رحمان کا جنہوں نے دو سال تک لگاتار اس پتھر پہ قسمت آزمائی کرتے ہوئے بالآخر موم کر ہی دیا۔ دو سال پہلے ہی وہ اس ہاسپٹل میں اپائنٹ ہوئے جہاں آپ کی کام کرتی تھیں۔ سالوں کی دوری بھی دونوں کے درمیان محبت کو ختم نہ کر پائی تھی اس کا اندازہ دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل آتے ہی ہو گیا۔ لیلیٰ آپ کی دل کو کھینچنے، مسکنے کی پریکٹس کرتے کرتے اتنی ماہر ہو چکی تھیں کہ انہیں ذرا دیر نہ لگی پھر سے خود کو سنبھالنے میں اور انہوں نے ڈاکٹر عمر رحمان سے مناسب فاصلہ اور بے گانگی اختیار رکھنا شروع کر دی جبکہ ڈاکٹر صاحب جلد ہی ہار مان گئے اور پھر سے تجدید محبت کا راگ اپنا شروع ہو گئے۔ لیلیٰ آپ کی راہ میں رکاوٹ صرف وہ قسم ہی نہ تھی جو انہوں نے کئی سال پہلے کھائی تھی کہ عمر بھر بے آباد رہ کر وہ اپنے بزرگوں کو ان کی اس غلطی کا احساس دلانے کی کہ ذات بات کے بے وجہ کے مسئلے کسی کی زندگی سے تمام رنگ اڑا دینے کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ بلکہ ان کے گریز میں ایک اور واضح عذر بھی شامل تھا اور وہ تھی ڈاکٹر عمر رحمان کی چار سالہ بیٹی۔

ڈاکٹر صاحب کی ماں نے چودھری باؤس سے اتنا ہتک آمیز جواب سننے کے بعد بیٹی کی شادی جلد ہی خاندان میں کر دی اس جلدی کی شادی میں سب کچھ جلدی جلدی ہوا۔ جلدی ہی ان کے ہاں ایک بیٹی ہوئی، بیٹی کے گیارہ ماہ بعد جلدی ہی ان کو ایک بیٹا بھی خدا نے دیا مگر جلدی ہی دونوں ماں بیٹا بیٹا شش کا شکار ہو کر چل بسے اور اس غم کو کیجے سے لگائے ڈاکٹر عمر نجانی اور کتنے سال تنہا گزار دیتے کہ جلدی ہی قدرت نے ڈاکٹر گل لیلیٰ چودھری سے ان کو دوبارہ ملوا دیا۔ البتہ ڈاکٹر لیلیٰ کو رضامند کرنے کا مرحلہ اتنی جلدی نہیں نمٹا اور کل رات ہاسپٹل سے واپسی پر لیلیٰ آپ نے بڑی امی سے صرف یہ کہا کہ۔

”عمر رحمان کی والدہ ایک بار پھر آپ کے گھر آنا چاہتی ہیں۔ یہ فیصلہ اب بھی آپ کے ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر عمر کے مجبور کرنے پہ میں صرف یہاں تک کی اجازت

ہے، پھوپھو کے بارے میں یوں بد تمیزی سے تو مت بولا کرو۔ وہ بے چاری تو اتنی مخلص ہیں، دیکھا نہیں اب بھی آپ کے لیے کیسے بھائیوں کو کنوٹیں کیا۔“
 ”بلکہ وہی کیوں؟ بھائی جان کینڈا کی تو خیر خبر لیجیے، آخر رخصت کے سسرال والوں کے کیا ارادے ہیں۔ رخی سے کیسے، جیٹھالی بن کر اب جینا کے دن رکھتے بھی آئی جائے۔“ جینا کی منگنی کے پھدے سے بے خبر پھوپھو نے نیا شوشہ چھوڑا۔
 ”اب میں کچھ کہوں گی تو پھوپھو کی چہیتوں کو برا لگے گا لیکن تم خود سوچو کس قدر شوق ہے انہیں سب کے ہاتھ پیلے پھٹ کرنے کا۔“
 ”شوق واکوئی مول نہیں۔“ شاداب گنگٹالی۔

گل لیلی! آپ کے سلسلے میں آنے والے مہمانوں کی خوشی تو سب کو تھی لیکن ساتھ میں جس طرح پھوپھو بار بار بڑے ابو سے بیلا کے لیے اصرار کر رہی تھیں، وہ کچھ لوگوں کے لیے الجھن کا باعث تھا اور ان کچھ لوگوں میں سے چند ایک کی الجھن میری سمجھ سے باہر تھی۔

بڑے ابو اور بڑی امی کی الجھن تو کچھ بیلا کی ناخوشی کی وجہ سے تھی کہ وہ جبراً اسے شجاعت کے لیے مجبور نہیں کر سکتے تھے حالانکہ بڑی امی کو تو اس میں کوئی قباحت نظر نہ آتی تھی وہ تو اس رشتے میں دل و جان سے فدا تھیں یہاں تک کہ خوشی خوشی بیلا کی ٹھکانی کر کے بھی اس کے مزاج درست کرنے پہ تیار تھیں لیکن رابعہ آنٹی اور بڑے ابو نے سمجھایا۔ ان کے تذبذب کی دوسری وجہ جینا تھی۔ جس طرح جینا کا معاملہ لٹکا ہوا تھا، ان حالات میں بڑے ابو چاہتے ہوئے بھی شبنم پھوپھو کو حتمی جواب نہیں دے سکتے تھے کہ وہ تو شادی پہ تلی بیٹھی تھیں۔ ہاں سنتے ہی تاریخ مانگ بیٹھتیں اور وہ جینا کا معاملہ واضح ہونے تک ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ بیلا کا منہ سو جا ہوا تھا تو اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی تھی۔ اس نے شبنم پھوپھو کے آنے سے پہلے ہی ان کے مقصد اور ارادوں پہ اس طرح جی بھر کے تنقید کی

حبیب کے لیے یہی لڑکی بھائی، تو آخر وہ مان گئیں۔ پھر یہ تو مت کیجیے کہ آپ سب اماں جی کی ضد کے آگے مجبور تھے۔ دراصل اندر سے آپ سب کی اپنی سوچ بھی اس وقت وہی تھی۔ اب بدلتے وقت کے تقاضوں نے بدلنے پر مجبور کر دیا ہے تو کھل کر تسلیم کریں اپنی غلطی اور اسے سدھارنے کا بھی سوچیں۔“

”ہاں بھائی صاحب! اب اس بات پہ توجہ دینے کا وقت نہیں کہ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے اور ایک بیٹی بھی موجود ہے۔ اب آپ کو صرف گل لیلی کی زندگی کے اتنے سہرے سال برباد کرنے کی غلطی کا ازالہ کرنا ہے۔“ بیلا نے رائے دی۔

”تو۔۔۔ پھر فون کر کے کل افطاری پہ مدعو کر لیں؟“ بڑے ابو خود دل سے راضی تھے۔ غرضے بعد سینے پہ بڑا بچہ ستاؤں کا بھاری پتھر سرکنے کے آثار نظر آئے تھے۔ بس بھائی بہنوں سے مشورہ کرنا باقی تھا۔
 ”ہاں جی۔۔۔ بسم اللہ کیجئے۔“ سب نے ہم آواز ہو کر کہا۔

”اللہ اللہ کر کے یہ برکتوں والی گھڑی آئی ہے بھائی۔“ بڑی امی بارے خوشی کے روپ میں تو آغیاں اٹھائیں۔ گلے لگانے لگیں۔

”میری لیلی بڑی صبر والی ہے۔ بیلا ہے اب بھی اس نے سارے اختیار ہاں باپ کو سونپ دیے۔ اتنے سالوں کی تلخی نے بھی ذرا سرخشی نہیں پیدا کی اس کے اندر اللہ اس کے صبر اور آزمائش کا صلہ دے۔“
 ”آمین۔ اور بھائی جان بات یہی مت لٹکائیے گا نہ لیلی کی نہ ہی بیلا کی۔ بس اللہ کا نام لے کر ہاں کیجیے اور تیاریاں شروع میں تو چاہتی ہوں وہ نول فراغت سے اکٹھے ہی سبکدوش ہو جائیے۔“ شبنم پھوپھو کی رائے پہ خوشی خوشی ساری کارروائی دیکھتی گل بیلا جل کر رہ گئی۔

”انہیں ضرور بیچ میں اپنے لاڈلے گھیسڑے ہوتے ہیں۔“

”اونہوں۔۔۔ بڑی ہیں وہ بیلا۔ تمیز سے بولا کرو۔“ کشف کو برا محسوس ہوا۔ ”تمہیں جو اعتراض ہے سو

اس نے بھی تمہاری طرح یہی بھاری بھر کم ساطعنہ دے مارا واقعی تم دونوں۔ اچانک تم اور بیلا دونوں ہی۔ ”کہتے کہتے میں رک گئی۔ یہ جملہ اب ضرورت سے زیادہ ہی جانا پہچانا ہو گیا۔ پہلے کی طرح یہ کہنے کے بعد مجھے یہ یاد کرنے کی ضرورت نہ پڑی کہ عطا نے اس فقرے کی مناسبت سے آخر اس روز کیا عجیب سی بات کی تھی۔ بلکہ کھٹ سے وہ بات میرے ذہن میں خود ہی گونج اٹھی۔

”پلیز ایک بار پھر سے کہو۔ میں اور بیلا۔ بیلا اور میں۔“

”عط۔ طا۔“ یاد آتے ہی جیسے ساری گتھی سلجھ گئی۔

”تو چوہری عطا اللہ نعمت۔ یہ ہے ساری کہانی۔ میں سمجھ گئی سب کچھ سمجھ گئی۔“ میں نے فاتحانہ غرے لگائے جنہیں وہ کسی خاطر میں نہ لایا۔

”تو کیا ہوا۔ تمہارے بچھنے سے کیا ہوتا ہے۔ جسے سمجھتا ہے وہ تو خود سے بھی انجان ہے۔ میرے حال دل سے کیا خاک واقف ہوگی اور جن کو یہ نیا پار لگانی ہے وہ چراغ تلے اندھیرا کیے بیٹھے ساؤتھ افریقہ میں چراغاں کرنے کی سوچ رہے ہیں۔“

”چراغ تلے اندھیرا نہیں بدھو، یہاں وہ مثال بھلی لگے گی، گھر کا مرغادال برابر یا پھر بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ یا پھر۔“

”چلو تم میرے مسئلے کو چھوڑو، پہلے میرے محاورات درست کر لو۔ امائے اردو۔“

”اچھا اور وہ جو تم دونوں ہر وقت میرے جملوں کو ٹوک ٹوک کر درست کرتے رہتے تھے وہ یاد نہیں۔ تم دونوں۔ تم اور بیلا۔ عطا اللہ اور گل بیلا۔ یعنی کہ گل بیلا اور عطا اللہ۔“ میں شرارت سے کہتی پیچھے پلٹنے لگی کہ اس سے کچھ بعید نہ تھا وہ مجھے سائیڈ میبل پہ پڑا گلہ ان بھی دے مارتا۔

”ہوں تو ان جناب کے چہرے پہ بارہ بجنے اور کمرے میں عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے درد بھرے گیتوں کے ابھرنے کا راز تو کھلا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے

تھی کہ اب اس کو یہ حقیقت تسلیم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ خود ان کا شکار ہو چکی ہے۔ یوں بھی اس کے بقول وہ دلن میٹرل نہیں ہے۔ چوڑیاں پننے سے اس کی کلائی میں خارش شروع ہو جاتی ہے، مندی کی خوشبو سے چھینکیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور ابٹن تو دیکھتے ہی ابکائی آ جاتی ہے لہذا اس کی شادی کا خیال بھی کوئی دل میں نہ لائے۔ لیکن اس کے اس فتویٰ پہ ایمان لانے کا کسی کا بھی ارادہ نہ تھا اس لیے سببم پھوپھو کی کوششیں بھی جاری تھیں اور بڑے ابو کا تذبذب بھی دم توڑ رہا تھا۔

البتہ شاداب اور عطا دونوں کے اترے چہرے اور چڑھی تیوریاں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ شاداب صبح سے سب کو کٹ گھانے کو دوڑ رہی تھی جبکہ عطا تھوڑی تھوڑی دیر بعد کمرے میں بند ہو جاتا۔ جب اس کی ضرورت پڑتی، غمگین سی شکل بنائے برآمد ہوتا، چپ کر کے کام کرنا اور پھر تاپنے کمرے میں عتاب جہاں درد بھری غزلوں کی صدا میں گونج رہی تھیں۔ سب سے پہلے میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”تم کیوں بو تھا بنائے بیٹھے ہو لڈو پیڑے۔“
”مجھے اس وقت مت چھیڑنا۔“ تکیے میں سر دیے وہ اوندھا لینا مسلسل پیرہلا رہا تھا۔

”تو پھر کوئی مناسب سا وقت آپ خود ہی تجویز کر دیجئے۔“ میں اس کی دھمکی سے ذرا مرغوب نہ ہوتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔

”میرا برا وقت چل رہا ہے جس میں کسی مناسب گھڑی کا ملنا ممکن نہیں۔“ اس کی مایوسی دل گر فتلی انتہا کو تھی۔

”تو یاروں دوستوں کی خدمات حاصل کرو میرے پیڑے! آخر ہم کس کام آئیں گے۔“
”تم کسی کام کی نہیں۔“

”بھی بیلا بھی یہی کہہ رہی تھی۔ لیکن یار اس کا مسئلہ دوسرا ہے۔ بھی جو کیس بنوں کی عدالت میں چل رہا ہو اس میں میں اس کی کیا مدد کر سکتی ہوں لیکن

اور نامعلوم رجسٹری تھی جو وہ بچپن سے بڑی امی کے لیے دل میں پالے ہوئے تھی۔ لیکن لیلیٰ امی وہ ہستی تھیں جن کے خلاف کوئی دل میں ہلکا سا غبار بھی نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے جیسے ہی شام کو مہمان آئے، شاداب اور عطا سمیت سب خوشی سے سرشار کسی اچھی خبر کے انتظار میں اکٹھے ہو گئے۔

پرانی تکلیف وہ باتوں کو چھیڑنے کے بجائے عمر رحمان کی والدہ نے نئے سرے سے بات چھیڑی اور یہی آسان طریقہ تھا تلخی سے بچنے کا۔ ان کے اس طرز عمل نے بڑے ابو کو فیصلہ کرنے میں تاخیر کا موقع نہ دیا اور یوں افطاری کے بعد باقاعدہ منہ میٹھا کرایا گیا۔ آنٹی رابعہ کا بنایا چیری اینڈ چیز کیک اور میرے تیار کردہ گاجر کے حلوے اور گلاب جامنوں نے خوب ساتھ دیا۔ امی کے چہرے پہ بھی عرصے بعد ایک رنگ تھا، ایک سکون تھا۔

ابھی اس خوشی کو صحیح طرح سے سیلیبیوٹ بھی نہ کیا گیا تھا کہ لیٹ ٹائٹ کنیڈا سے آنے والی صفدر بھائی جان کی والدہ کی کال نے سوگوا ری پھیلا دی۔ اگرچہ رہنے امی کے بتانے کے بعد سب ہی اس رشتے سے بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے خود کو ذہنی طور پہ تیار کر چکے تھے لیکن اب منگنی توڑنے کا باقاعدہ اعلان سب ہی کو خاموش کر گیا۔ مینا نے جتنا رونا تھا، رو چکی تھی اب سر جھکائے بیٹی ناخن کھرچ رہی تھی۔ بیلا ”مودے نیم پس“ کو بے نقط سنارہی تھی۔ بڑی امی کے چہرے کا رنگ پھر سے پھیکا پڑ گیا تھا اور بڑے ابو کے شانے پھر سے جھک گئے تھے۔ شبنم پھوپھو کے لیے یہ خبر ایک شاک تھی کیونکہ وہ پہلے کے واقعات سے ناواقف تھیں۔

”بھالی! آپ نے پہلے ذکر ہی نہ کیا۔“

”کیا کہتی، دل ہی دل میں سب صحیح ہونے کی دعا کرتی رہی۔“

”ارے جب پتہ تھا کہ آج کل میں یہ ہونا ہے تو کیوں نہ خود پہلے فون کر کے انکار دے مارا ان خبیثوں کے منہ پہ۔“

بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔ ٹھہرو پہلے یہ عقبرہ تو سلجھا لیں کہ شاداب لی لی کی بجھی بجھی سی کیفیت کے پیچھے بھی تو کسی واردات قلبی کا ہاتھ نہیں؟ ہیں۔ شجاعت۔ نہیں نہیں۔ لیکن ہاں ہاں۔ ہو بھی سکتا ہے اگر عطا کے دل میں بیلا کنڈلی مار کے بیٹھ سکتی ہے جن کے سفارتی تعلقات بچپن سے ہی کشیدگی کا شکار ہیں تو شاداب کو شجاعت کیوں نہیں پسند آ سکتا۔

اندازے لگاتی میں شاداب کے پاس جا پہنچی بڑی دل سوزی سے اس کے چپ چپ رہنے کی وجہ دریافت کی۔ جواباً وہ پھٹ پڑی۔

”تم کبھی میری بات یہ یقین نہیں کرتیں۔ دیکھ لی اب تم نے بڑی امی کی چالاکی۔ چلو مان لیا گل لیلیٰ امی کے لیے آنے والے رشتے میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں لیکن آخر کوئی تو وجہ ہوگی جو شبنم پھوپھو کو سوائے ان کی بیٹیوں کے اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔“ مجھے اپنا خدشہ درست ہوتا معلوم ہوا۔

”ہاں۔ واقعی میرا تو خیال تھا شجاعت کے ساتھ تم زیادہ سوٹ کرتی ہو۔“ میں نے تاک کر نشانہ لگایا لیکن وہ بدک اٹھی۔

”فخ دوس۔ میں کوئی یہ تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ کشف بھی ہے، تم بھی ہو، رحمہ ہے پھر آخر مائی امی پھوپھو کو کسی اور طرف جانے کیوں نہیں دے رہیں۔ صاف ظاہر ہے انہیں گھیرے بیٹھی ہیں۔ فضیلہ، آنٹی کلج کے چکروں میں بڑی رابعہ آنٹی ہیں تو ہر وقت عبادات و وظائف میں مصروف اور ہماری تو خیر ماں ہی نہیں، جو کچھ سوچے، ایسے میں مائی امی کے مزے ہیں۔“ وہ غصے میں بڑی امی کو اکثر مائی امی کہہ جاتی۔

”تو ابھی کون سا ہاں کر دی ہے انہوں نے آج تو اللہ اللہ کر کے امی کا فیصلہ ہو گا پھر۔“

”ہاں پھر بیلا اور دیکھنا یہ جو مینا کا بہانہ بنایا جا رہا ہے تاخیر کے لیے وہ بھی صرف پھوپھو کی توجہ مینا کی طرف کرنے کے لیے ہے۔“

”نئے منہ۔“ میں کسی اور بات کی کھوج میں آئی تھی، پتہ چلا شاداب کے اترے چہرے کی وجہ وہ حسد

”یہ کیا بات ہوئی بھالی! آخر پہلے بھی تو آپ ایک ہی گھر میں دو بیٹیاں بیاہ رہی تھیں، پہلے مینار بننے کی دیورانی بننے جا رہی تھی اب چھوٹی بہن کی جیٹھانی بن جائے تو کیا برا ہے۔“

”تمہیں کیسے سمجھاؤں شبنم! میں نے خود کو صرف ان چار لڑکیوں کی ماں ہی نہیں سمجھا بلکہ اس گھر کی ہر بچی میری بچی ہے اور خصوصاً رحمت اللہ کی تینوں بچیاں، ان بن ماں کی بچیوں کو تو میں نے اپنی ذمہ داری ہی سمجھا ہے۔ میں تمہارے آگے کسی ایک کا نام تجویز نہیں کروں گی کہ یہ بچیاں مجھے اتنی بھاری نہیں جو نام لے کر تمہیں رضامند کروں۔ وہ تو تمہاری اپنی مرضی ہے کہ تم کس کو لیتی ہو، لیتی بھی ہو یا نہیں لیکن تمہاری محبت پر یا میرے خلوص پہ کوئی شک کرے یہ مجھ سے برداشت نہ ہو گا۔“

میں نے کن اکیلوں سے شاداب کو دکھا، وہ نظریں چرا رہی تھیں۔

”کیسے باتیں کر رہی ہیں بھالی! کسی کو کیا اعتراض ہو گا۔“

”کسی کو نہ بھی ہو مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میں تو اکیٹھی تین تین بیٹیوں کی شادیاں منٹاتی پھوں اور رابعہ حبیبہ کی ایک بیٹی کی بھی بات طے نہ ہو۔ نہیں انہیں کوئی رشتوں کی کمی تھوڑا ہی ہے۔ میری شاداب، سحاب، کشف، رحمہ سب شکل و صورت تعلیم ہنر میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اگر تمہاری بات مان لوں تو ان پہ کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن مجھے بے اطمینانی سی رہے گی کہ میں نے اپنی دوسری بیٹیوں کا حق مار لیا۔ مینا کی قسمت میں جو ہو گا اسے مل جائے گا۔“

وہ رخساروں پہ بننے والے آنسو صاف کر رہی تھیں اور ہر کھڑی شاداب کا چہرہ آہستہ آہستہ بھیک رہا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ بہتر تھا وہ خود ہی شرمندہ ہوتی۔



”کس کا فون تھا سیماب بیٹا؟“ رابعہ آنٹی نے

بیلا ماحول کی ٹینشن کے باوجود میرے کان میں گھس کر کہنے سے باز نہ آئی۔ ”گلتا ہے جملہ توڑ مروڑ کر کہنے کی عادت تم نے پھوپھو ہی سے لی ہے۔“

”اور کچھ نہیں تو کم از کم مجھے ہی بتا دیا ہوتا۔ گل لیلنی کے بعد اصولاً تو مجھے بیلا کے بجائے مینا۔ لیکن وہ مسلوب تھی تو اس لیے۔“ چانک انہیں کمرے میں موجود چار بکریوں کا دھیان آیا۔

”اے لڑکیو! ذرا تم لوگ باہر تو نکلو۔“ لیکن ہمارے کان کھڑے ہو چکے تھے خصوصاً میرے۔ جو عطا کو اچھی خبر سننے کا لارا لگا آئی تھی۔ پھوپھو کے مبہم سے الفاظ مجھے امید دلا گئے کہ شاید اب بیلا کے بجائے وہ مینا کو اور بیلا اور عطا۔ عطا اور بیلا۔

اسی لیے چپ چاپ سر جھکا کر باہر نکلنے کے بعد ہم تینوں۔ جی ہاں ہم تینوں لائن بنا کر دروازے کے پاس کن سوئیاں لینے کھڑے ہو گئے اور پوچھی گئی تین ہاتھ چھڑا کر لاؤنچ میں نگل گئی۔ اسے شاید اب کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ میں نے کان لگا دیے۔

”شیریں بھالی! ویسے تو یہ بات سب کو بتھا کر کرنے والی ہے، لیکن آپ سے پہلے یہ ذکر صرف آپ کو دلدادہ دینے کے لیے کر رہی ہوں کہ مینا کے لیے اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں منٹنی ہی نہ ہوتی ہے نا۔ ایسا کیا غضب ہو گیا۔ ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے، جان چھٹی چندالوں سے آپ فکر مت کرنا۔ میرا دوسرا بیٹا حاضر ہے۔ آخر صداقت بڑا ہے پہلے اس کا کروں گی تو سبکی کی باری آئے گی وہ تو بیلا کے ساتھ صداقت کا جوڑ نہیں بیٹھ رہا تھا اس لیے چھوٹے کا نام لیا۔ اب میں بھائی جان سے آپ کی دونوں بیٹیوں کے لیے سوال کروں گی۔“

نہیں شبنم بہن! یہ تمہاری محبت ہے۔ میں اس کی قدر کرتی ہوں لیکن دیکھو یہ ذکر مت کرنا۔ جانے دو اس بات کو۔ بس بیلا کی بات کرو اب میں دو دو بیٹیاں کیسے تمہیں۔ تم مجھے غلط مت سمجھنا مگر۔“ انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے فوراً انکار کر دیا۔ پھوپھو کا بکا رہ گئیں۔

پوچھا۔

”وہ شاداب کی ایک دوست ہوا کرتی تھی نا۔ عروج۔“ میں نے ریسور رکھتے ہوئے تفصیل بتانا چاہی کہ پیلانے بات اچھل۔

”وہی جس کا زوال بی اے کے دوران ہی ہو گیا تھا۔“

”ہاں ہاں وہی جس کی شادی ایگزائز سے ٹھیک دو ہفتے پہلے ہو گئی تھی۔ یاد ہے آپ کو آئی، ہم بھی گئے تھے شادی پر۔“

”ہاں وہ بچی تو شاداب کی خاصی اچھی دوست ہوا کرتی تھی۔ سنا تھا کہ آرمی آفیسر سے بیاہی گئی ہے اور کسی دور دراز کے شہر میں پوسٹنگ ہو گئی ہے۔ خاصے عرصے کے بعد فون آیا ہے اس کا۔“

”جی“ آج کل اپنے میکے آئی ہوئی ہے اور کہہ رہی تھی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آ رہی ہے۔ میں نے بتایا بھی کہ شاداب ابھی یونیورسٹی میں ہے اور وہاں سے سیدھی کوچنگ سینٹر چلی جائے گی، تم شام کو چلی آنا لیکن ساری بات سننے کے بعد بھی کہنے لگی کہ بس ہم آ رہے ہیں۔“

”ہم؟“ آئی پوچھیں۔ ”اس کا بسپینڈ ہو گا ساتھ میں؟“

”شاید وہ بھی ہو اپنی امی اور بھائی کے ساتھ ہونے کا تو اس نے بتایا ہے۔“

میری اس اطلاع پر رابعہ آئی نے معنی خیز انداز میں بڑی امی کو دیکھا، وہ بھی پالک چنتے چنتے رک کر بات کو جانچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کے لبوں پر ایک مشترکہ مسکان پھیلی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ آنے والے مسلمانوں کے استقبال کی تیاری شروع ہو گئی۔

آئی اور بڑی امی کی خالیں بیٹی کی ماں ہونے کی حس نے بالکل درست سگنل دیا تھا۔

عروج کے بھائی کے لیے لڑکی کی تلاش جاری تھی۔ اس کے میکے آنے کے بعد جب اس سے مدد طلب کی گئی تو اس کی آنکھوں کے آگے اس کی اکلوتی دوست

شاداب کا چہرہ آگیا۔ جس کے ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور خوش مزاجی کی وہ شروع سے قائل تھی۔ اس نے شاداب کا نام لیا تو اس کی امی اور بھائی کو بھی وہ دراز قامت، لمبے بالوں اور بڑی بڑی غزالی آنکھوں والی زندہ دل لڑکی یاد آگئی جس کے نام کی طرح شادابی اس کی پوری شخصیت پر چھائی ہوئی تھی۔

عروج پوری فیملی کے ساتھ آئی اور آتے ہی مدعا ظاہر کر دیا گیا۔ ایمر جیسی میں فون کر کے بڑے ابو اور بڑے پاپا کو بلایا گیا۔ وہ لوگ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے خواہاں تھے لیکن رابعہ آئی نے سلیقے سے ان سے سوچ بچار کے لیے وقت طلب کرتے ہوئے ٹالا۔ عروج کی امی نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا ماکہ وہ لوگ بھی اچھی طرح ان کے بیٹے عامر کو دیکھ بھال لیں۔ وہ بس نکلنے ہی والے تھے کہ ٹھکی باری شاداب آگئی۔ اتنے عرصے بعد عروج کو اپنے سامنے پا کر خوشی سے بے حال ہو گئی۔

”ارے یہ کیا میں آئی اور تم چل دیں۔ کچھ دیر بیٹھو نا۔“ وہ ہاتھ کھینچ کر اسے اندر لے جانے لگی۔

”بہت دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔ دوبارہ آؤں گی تو تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزاروں گی۔“

”اظہاری میں کچھ وقت رہتا ہے۔ آپ لوگ رک ہی جائیں تو بہتر ہے۔“ آئی نے ایک بار پھر مہمان نوازی نبھاتے ہوئے اصرار کیا۔

”اب تو آپ دوبارہ بلائیں گے تو آئیں گے۔“ عروج کی امی نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ آئی نے جواباً کچھ کہنے سے فی الحال احتراز کیا۔ ان کے جانے کے بعد شاداب برہم مانے لگی۔

”یہ عروج کس قدر عجیب سی ہو گئی ہے ایک تو دوست سے ملنے کے لیے پورا ٹبر اٹھالائی، دوسرا جاتے جاتے پھر سے کہہ گئی کہ اب مدعو کریں گے تو آئے گی حالانکہ شادی کے فوراً بعد میں نے اسے اور اس کے گھونچو سے میاں کو کھانے پر بلایا تھا اب ہر بار خصوصی دعوت دوں گی تو کیا تب آئیں گی محترمہ اتنا نہیں ہو سکا محترمہ سے کہ جھوٹے منہ مجھے ہی کہہ دیتی اپنے گھر

آنے کے لیے۔“

”جھوٹے منہ نہیں وہ سچے منہ تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“
پیٹ کی ہلکی جینا نے فوراً اسے ایک طرف لے جا کر ساری بات بتائی۔ میں اس کے چہرے پہ پھیلے ست رنگے جذبات دیکھنے اور بیلا کی جھنجھلاہٹ دیکھنے کی غصہ ہی رہی اس نے معمول کے انداز میں ساری خبر یوں سنی جیسے جینا نے اسے نماز مانتے ہونے یا آنا سنا ہونے کی خبر سنائی ہو۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے بے فکری سے شانے اچکائے۔

”اچھا اچھا۔ میں بھی کوں یہ عروج کے تاثرات اتنے راسر سے کیوں ہیں۔“

”شادیوں کا ایک سیزن ہوا کرتا ہے یہ تو سن رکھا تھا کہ سال میں ایک آدھ مہینے ہوا کرتا ہے جن میں ہر گلی میں قنات لگی ہوتی ہے اور ہر ٹیکو سٹ ہال میں دو دو تین تین شغفیں لگا کرتی ہیں لیکن ایسا پہلی بار دیکھا ہے کہ یوں رشتوں کی وبا پھوٹ پڑی ہو اور میں تو کہتی ہوں جو باقی بچی ہیں وہ اپنے طور پہ کوئی حفاظتی سیلے لگوا لیں اس سے پہلے کہ کوئی مسلک وارس ان کو اپنی پلیٹ میں لے لے۔ میرا خیال ہے یہ جراثیم کشیم چھپو اپنے ساتھ ساؤتھ فریقہ سے لائی ہیں۔“ بیلا نے حسب عادت اس کا سہرا بھی چھپو کے سر پر اندھا۔

”اور میرا خیال ہے کہ بڑی امی نے رسالے میں روحانی مشوروں والے کالم سے ہانڈی تالے کا وظیفہ بڑھ لیا ہے اور شاید زیادہ ہی تعداد میں ہانڈیاں جمع کر لیں اسی لیے روز کے دو دو تین تین رشتے طے ہو رہے ہیں۔“ کشف نے قیاس آرائی کی۔

”امی پڑھنا جانتی ہی نہیں اور معاف کرنا زیادہ وظیفہ تمہاری امی کرتی ہیں۔ یقیناً“ رابعہ آنٹی کی تہجد کی نمازیں اور لمبے لمبے سجدے کام کر گئے ہیں رمضان کا مہینہ ہے، ٹیائپ رحمتیں برس رہی ہیں۔“ جینا نے کہا تو بیلا نے فوراً اختلاف کیا۔

”رحمتیں؟۔ اور تم یہ کیا برسی۔ اسے بھی پھر رحمت سمجھو، آدھی آدھی رات تک سسکتی کیوں

رہتی ہو۔“

”تم دونوں آپس میں چونچ ہی لڑاتی رہا کرو۔ دیکھنا ایک دن کیا نتیجہ نکلے گا۔ ایک کی چونچ گم ہوگی تو دوسری کی دم۔ یہ سوچو اب سب کا کیاری ایکشن ہوگا اس رشتے کے بارے میں رات کی میننگ کی تمام تفصیل لانے میں کون میری مدد کرے گا۔“ تقریباً سب ہی کے ہاتھ کھڑے ہو گئے۔ میں نے افسوس اور ندامت سے سر ہلایا۔

”کیسی اچھی بچیاں ہوا کرتی تھیں ہم اپنے آپ میں مگن، بے پروا، بے ضرر۔ یہ نت نئی رونما ہونے والی رشتہ داریاں ہمیں کیسی بری لت میں مبتلا کر گئیں۔ کیا چکا کار دیکھا ہے جاسوسی کرنے کا۔“

”لگتا ہے تم دو شیرازوں سے خواتین بننے کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہیں۔“ حمزہ نے پیش گوئی کی جسے سن کر سب احتجاجاً چلا اٹھیں۔



جو تھے دن چودھری ہاؤس سے ایک جتھے کا اجتماع امر کو دیکھنے روانہ ہوا۔ عطا پر سب ہی نے زور ڈالا جلنے کے لیے لیکن وہ بے دلی سے سٹنٹ میں مصروف رہا۔ اسے رات کو ہی واپس رسالہ پور جانا تھا۔ اگرچہ اس کی تین چھٹیاں باقی تھیں لیکن بڑے ابو کے کہنے پہ وہ واپس جا رہا تھا ماکہ یہ تین چھٹیاں عید کے موقع پہ کام میں لائی جاسکیں۔

کشیتم چھو پھو کی ساس بھی مع اپنے بڑے بیٹے اور اس کی فیملی کے عمر سے واپس آرہی تھیں اور آج انہیں اپنے سسرال جانا تھا لیکن شاداب کی وجہ سے انہوں نے بیٹوں کو دادی کے پاس بھیج دیا اور خود ایک دن کے لیے رک گئیں۔

”عطا! تم اپنی چلے جاؤ گے۔ ایسے ہی۔؟“ میں نے بیک میں کپڑے ٹھونکتے ہوئے عطا اللہ سے پوچھا۔

”جیسے اس کی خاموشی اور اس کی کر رہی تھی۔ اگرچہ بیلا کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اور کچھ جینا کے ساتھ ہونے

کنوارہ نہیں رہوں گا۔" وہ پھسکی سی ہنسی کے ساتھ میرادل رکھنے کے بولا۔ "اور کوئی نہیں تو تم تو ہو۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں یونہی درد مندی سے سر ہلاتے ہلاتے چونک گئی۔ "کیا؟ کیا بکواس کی تم نے؟ فضول انسان۔" اس کی پھسکی ہنسی، مرامرا لہجہ اور بھیگی سی پلکیں صاف اس کے دل کا حال بتا رہی تھیں لیکن میں اس کا دھیان بنانے کے لیے جھوٹ موٹ لڑنے بیٹھ گئی۔

"تم لڑ کے ہوتے ہی ایسے ہو۔ ابھی کسی کے فراق میں آہیں بھر رہے ہوتے ہیں اور ذرا کسی اچھی شکل نے کچھ توجہ دی فوراً اس پہ لٹو ہو گئے موقع ملنا۔"

بات کرتے کرتے میں رک گئی اور لب دانتوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگی۔ ایک شیطانی منصوبہ میرے زرخیز ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ میرے لب آپوں آپ مسکرا نے لگے۔

ان دس بارہ دنوں میں خاصا کچھ طے پا چکا تھا۔ گل لیلیٰ آپنی کارشتہ تو ڈاکٹر عمر رحمان کے ساتھ ہو ہی چکا تھا۔ ایک دو ہی میٹنگز میں عامر کو بھی سب نے اوکے کر دیا۔ شاداب سے پوچھا گیا تو اس نے سب کچھ بڑی امی یہ چھوڑتے ہوئے نہ صرف ان کا مان بڑھا دیا بلکہ اپنے دل پہ بڑے ندامت کے بوجھ کو بھی اتار پھینکا۔

گل لیلیٰ آپنی اور شاداب دونوں کے سلسلے میں متکئی وغیرہ کا بھیجیٹ نہیں پالا گیا، عید کے فوراً بعد شادی طے پا گئی تھی۔ بیلا کا معاملہ ہنوز لٹکا ہوا تھا۔ شبنم پھوپھو اب اپنے سسرال میں تھیں لیکن ہر دوسرے دن سب "سٹائل اینڈ جیکل" کے چکر لگانا نہ بھولتیں۔ ہر بار ان کی آمد پہ بیلا تلملا جاتی۔ اب تو بڑے ابو نے بھی بڑی امی کو کتنا شروع کر دیا تھا کہ ہاں یا ناں میں جواب دے کر شبنم کو فاریغ کرو لیکن بڑی امی اتنا اچھا رشتہ چھوڑنے پہ تیار نہ تھیں، اس لیے ناں کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ دوسری طرف بیلا کے ہوتے وہ چھوٹی کی بات ٹھہراتے جھجک رہی تھیں۔ بیبا یوں بھی زود رج سی لڑکی تھی اور اب متکئی ٹوٹنے کی وجہ

والے تلخ حادثے کی وجہ سے ابھی تک پھوپھو کو واضح ہاں نہیں کی گئی تھی لیکن سب جانتے تھے کہ پھوپھو ہاں کروا کے ہی دم لیں گی۔ ادھر بیلا پیر پختی پھر رہی تھی ادھر عطا کی آنکھیں ہر وقت سوچی سوچی نظر آتیں۔ مجھے دونوں عزیز تھے اور میں دونوں میں سے کسی ایک کے مسئلے کا حل ضرور مخلصانہ طور پہ نکالنا چاہتی تھی۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ عطا کی دل گرفتگی دور ہو جائے اور اس کا حل تو یہ بھی تھا کہ شبنم پھوپھو کے بجائے رابعہ آنٹی بیلا کے پیچھے بڑ جائیں اور رہی بیلا تو اس کے پیر تو اس صورت میں بھی پہنچتے ہی رہیں گے۔ اسے تو شادی سے ہی چڑھی۔

لیکن بھلا اس میں میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کی شادی کیس نہ کہیں تو ہونی ہی ہے۔ بڑی امی جیسی اچڑکی ٹھکانے لگاؤ ٹائپ خاتون "اسے زندگی بھر بے مہار تو نہیں پھوڑ سکتی تھیں۔ پھر کیوں نہ بے چارے عطا کے ہی چند دن کے ارمان پورے ہو جائیں۔ یہی سوچ کر میں عطا کو اکسار ہی تھی کہ وہ ہمت کر کے اپنے ماما یا سے بات کرے۔

"کیا کروں میں؟ ماما کو بتانا مشکل نہیں اور نہ ہی یہ مسئلہ ہے کہ انہیں بیلا پہ کوئی اعتراض ہو گا لیکن یارا وہی ان کی روایتی وضع داری اور لحاظ۔ یہ آڑے آئے گا۔ بیلا بھی نہیں چاہیں گے کہ اس صورت میں جبکہ شبنم پھوپھو پہلے ہی بیلا کی امید داریں اور بیچ میں ٹانگ اڑا کے اپنے بیٹے کے لیے سوال کریں اور وہ میرا نہیں بلکہ بیلا کا باپ بن کر سوچیں گے کہ اس کے لیے کون سا لڑکا مناسب رہے گا۔ مجھ جیسا تازہ تازہ بلیسٹ یا پھر شجاعت کے جیسا سٹیل بزنس مین ان کا ووٹ بھی اسی کو ملے گا۔" اس نے حقیقت پسندی سے تجزیہ کیا۔

"اوہ! ایسا کیا دھرا ہے اس زکوٹے جن میں۔ بیلا نے اس کے بالکل صحیح نام دھرے ہیں، زکوٹا، قباچہ اور ڈنٹونک کا ٹریڈ مارک تم یونہی کا پلکس کا شکار ہو رہے ہو ورنہ تمہارے آگے وہ کچھ بھی نہیں۔"

"ذرا نوازی کا شکریہ۔ اور تم فکر مت کرو۔ عمر بھر

سے کچھ زیادہ ہی حساس اور روکھی سی ہو گئی تھی۔ بیلا کے لیے ہاں کر کے وہ بینا کی خود ترسی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

عطا کا فون بھی تقریباً "ہر روز آ جاتا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ اس سے بات تب کروں گی جب میرے پاس اس کے لیے کوئی خوشخبری ہوگی۔ اس لیے ہمیشہ موقع سے غائب ہو جاتی۔ میری مہم زور و شور سے جاری تھی اور اب اس کی کامیابی کے خالص امکانات نظر آرہے تھے۔ یہ میری چند روزہ محنت کا نتیجہ تھا اور مجھے امید تھی کہ اور چند دنوں تک میں حسب نشانہ کج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی حالانکہ پہلے دن کمر کس لینے کے بعد مجھے اچھی خاصی کوفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ عجیب بدھوی احمق سی لڑکی ہے یہ کشف بھی ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

جی ہاں کشف چودھری۔ میں نے اس کے ذریعے ہی شجاعت علی سے چھٹکارا لانے کا سوچا تھا اور چونکہ یہ چھٹکارا مستقل بنیادوں پر پایا نہیں جاسکتا تھا کہ شجاعت چودھری ہاؤس کی لاڈلی بیٹی شبنم کے صاحب زادے تھے اس لیے یہی ہو سکتا تھا کہ یہ جن گل بیلا چودھری کے بجائے کسی اور کو چمٹ جائے اور اس مقصد کے لیے وہی نام میرے سامنے تھے۔ کشف اور رحمہ۔ دیکھا جائے تو دونوں ہی بے مثال تھیں۔

کشف نیلی آنکھوں، گولڈن بالوں اور سنہری رنگت کے ساتھ بالکل ایک فرانسیسی حسینہ نظر آتی، جس نے کسی فینسی ڈریس شو کے لیے مغلیہ شہزادی کا روپ دھار رکھا ہو۔ انارکلی کے لباس میں جیولٹ انگلش کلر بالوں کی کھینچ کے بنائی چوٹی، چوڑی دار پاجامے، لمبے لمبے دھوپوں اور کانوں میں ڈالی سونے کی گول گول بالیوں کے ساتھ وہ بڑی پیاری سی لگا کرتی۔ عرصے سے وہ فقط یہ بالیاں ہی جیولری کے نام پر استعمال کر رہی تھی۔ اس کے نیلے غنوں پر رکھا چشمہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ لی بی خاصی پڑھا کو ہیں ورنہ اپنی بھول بھالی باتوں سے وہ کسی طرح بھی ہیومن سائیکالوجی میں ماسٹرز کرتی نظر نہیں

آتی تھی۔

دوسری طرف رحمہ بھی کسی سے کم نہ تھی۔ اس کی آدھی سے زیادہ دلکشی تو اس کی نرم نرم مسکان میں چھپی تھی اور باقی اس کے آرٹسٹک سے ہاتھوں میں۔ وہ سر سے پیر تک ایک آرٹسٹ نظر آیا کرتی۔ لیکن ایک تو اسے اس مقصد کے لیے آگے کرنے میں قیامت یہ تھی کہ وہ خاصی آدم بیزار واقع ہوئی تھی کم ہی باہر نکلنے اور کسی سے بات کرنے پر آمادہ ہوتی اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں پہلے اس کی ممتیں کرتی، ہاتھ پیر جوڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی اور پھر شجاعت سے علیک سلیک کرواتی۔ اس کے برعکس کشف بڑی حد تک میری فرماں بردار تھی۔ لاکھ پڑھائی میں مگن ہو، میرے ایک اشارے پر میرے ساتھ کہیں بھی چلنے کو تیار ہو جاتی اور سب سے بڑی بات میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ شجاعت کے بارے میں اچھی رائے رکھتی ہے۔ یعنی اسے ہموار کرنے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

اس دن جب شجاعت پھوپھو کو اور اپنی دادی کو لے کر ہمارے گھر آیا میں خاصی افراتفری کے عالم میں کشف کو گھسیٹتی لے گئی۔

"شجاعت! پلیز ہمیں ذرا مارکیٹ لے چلیے۔"

"جی میں؟ لیکن میں تو۔"

"پلیز دیکھیے بہت ضروری کام ہے۔ بڑے پیایا چاچو ہی ہمیں شاپنگ کے لیے لے جایا کرتے ہیں یا پھر عطا اگر موجود ہو تو لیکن۔ چاچو رات کو دیر سے گھر آئیں گے تب تک ٹیلر دوکان بند کر جائے اور مجھے ابھی وہ سوٹ چاہیے۔"

"ہاں جی، بہت ضروری جانا ہے۔" کشف کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کون سا سوٹ، کیسا سوٹ لیکن اس نے میری ایمر جنسی کو دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا۔

"لیکن سحاب! میں یہاں کے راستوں پر ڈرائیونگ نہیں کر سکتا۔ میں لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کرتا ہوں۔ تایا جی کا ڈرائیور ہی ڈرائپ کر کے گیا ہے۔ اگر آپ کچھ دیر

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی بیوٹی آئل



- * گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
- * نئے بال اگاتا ہے
- * بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- * مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے یکساں مفید
- * ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے

”سوہنی بیوٹی آئل“

قیمت 60 روپے 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب

ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں دستی خرید جاسکتا ہے ایک شیشی کی قیمت صرف 60 روپے ہے دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر ہسٹرو پارسل سے منگوائیں رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے سمجھوائیں۔

- ایک شیشی کے لیے 80 روپے
- 2 شیشیوں کے لیے 140 روپے
- 3 شیشیوں کے لیے 210 روپے
- نوٹ: اسے میرے ٹاک خراجہ ادھ پیکنگ چارج شامل ہے
- سے آرڈر بھیجنے کے لیے ہم راپت

بیوٹی بکس 53 اورنگریز مارکیٹ سیکٹر فور ایم اے جاع روڈ کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی آئل من تو دل سے حاصل کریں
9 بیوٹی بکس 53 اورنگریز مارکیٹ سیکٹر فور ایم اے جاع روڈ کراچی

9 مکتبہ عمران ڈائجٹ 37 اردو بازار کراچی
فون نمبر 7735021

پہلے کہتیں تو میں اسے روک لیتا۔ یا پھر ایسا کریں کہ وٹ کر لیں۔ وہ ہمیں لینے آئے گا تو پہلے آپ کو مارکیٹ لے جائیں گے پھر۔“
”نہیں نہیں بہت دیر ہو جائے گی۔“ میں فکر مندی سے ہاتھ ملنے لگی۔
کشف نے رائے دی۔

”یار میرے دو نئے سوٹ سل کے آئے ہیں۔ تم ان میں سے کوئی پہن لو۔ ویسے جانا کہاں ہے؟“
میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔
”ہمیں زیادہ دیر نہیں جانا یہ راؤنڈ اپاؤٹ کے اس طرف منی مارکیٹ میں ٹیرنگ شاپ ہے۔ اس وقت ٹرنگ بھی نہیں ہے۔ پلیز۔“ میں نے پلیز بڑے اشائل کے ساتھ کہا۔ اسے مانے ہی نہ تھی۔
”چلیں پھر۔ سلو ڈرائیو کروں گا۔“
”یار سحاب! رستے دیتے ہیں ایک سوٹ کی خاطر مروانہ دینا۔ فائنل لیگنر سب سے پہلے ہی مرگئی تو دو سال کی محنت بے کار جائے گی۔“

کشف ڈر رہی تھی مگر میں نے زبردستی اسے آگے دھکیلا۔ جب شجاعت کار کا مالک کھول کر مین گیٹ کھولنے آئے گیا تو میں نے جلدی سے پچھلی سیٹ پر چھلانگ لگائی۔ میرا پلان تھا کہ جیسے ہی کشف بیٹھنے لگے گی میں فکر مندی شکل بنا کر اسے احساس دلاؤں گی کہ ہمیں اس طرح بے چارے معزز مہمان کو ڈرائیور کی طرح نہیں ٹریٹ کرنا چاہیے اس لیے بستر ہو گا وہ آگے بیٹھ جائے لیکن میرے کہنے سے پہلے ہی کشف دندو سے جھانک کر کہنے لگی۔

”یار! یہ تو بہت آگ لگ رہا ہے۔ ہم دونوں ہی پیچھے بیٹھ گئے تو۔ آئی مین اچھا نہیں لگتاں۔ اس طرح شجاعت۔“

”ہاں تو پھر۔ کیا کریں۔“ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے میں نے بظاہر بے فکری سے پوچھا۔
”ہوں۔“ سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اوپر ٹیرس کی طرف نگاہ اٹھائی کبھی پلیز کم بیئر۔
”دھت تیرے کی۔“ میں نے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔

”چلو کئی شجاعت کو کمپنی دے لے گی۔“ وہ میرے ساتھ جم کے بیٹھ گئی۔ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے میں نے کہا۔

”وہ تو تم بھی۔ میرا مطلب ہے ہم بھی دے سکتے ہیں۔“

”لیکن ہم تو شاپنگ کریں گے ناں۔ بھی اب مارکٹ جا رہے ہیں تو خالی نیلر کے پاس سے ہو کر آنے کا کیا فائدہ۔“

میں دانت چستی رہ گئی۔ واپسی پر بمشکل اپنے خراب موڑ پر قابو پاتے ہوئے مختصر دور اپنے راستے میں شجاعت اور کشف کو بار بار آپس میں کشف کرنے پر مجبور کیا۔ شاید میں کسی نہ کسی طرح اس زکونا کو کشف جیسی نازک پری کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی کہ اگلے ہی روز وہ پھر موجود تھا اور اس بار پھوپھو کے ساتھ نہیں بلکہ اکیلا ہی آیا تھا۔

”نیمائس صحاب! آپ کے اصرار نے میری جھجک تو دور کی۔ آج میں تایا جی کے گھر سے یہاں تک اکیلا ڈرائیو کر کے آ رہا ہوں اتنے دنوں بعد انٹرننگ تھا منے کا مزہ ہی اور ہے۔“

”ابھی تو بچو! تمہاری اچھی خاصی جھجک دور کرنی ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں مسرور ہوتے ہوئے سر ہلایا۔ ”اب یہ بھی اگل دو کہ کس کے دیدار کی طلب یہاں تک کھینچ لائی۔ صرف باپتھیں چیر چیر کے مسکرانے سے کام نہیں چلے گا۔“

میں نے خود کلامی جاری رکھی لیکن وہ بھی اچھا خاصا کائیاں تھا اگرچہ منحصر آنکھیں، بلاوجہ پھیلتی مسکراہٹیں اور بوکھلاہٹیں کتنے ہی راز کھول رہی تھیں پھر بھی اس نے منہ سے پھوٹ کے نہ دیا کہ وہ کشف کو دیکھنے کی چاہ میں یہاں چلا آیا ہے۔

میں نے ایک اور حربہ آزمایا۔ پھوپھو کا سسرال وینفیس میں تھا۔ میں اپنی دوست رجا سے ملنے کے بہانے کشف کو ساتھ لے گئی۔ بمشکل پندرہ منٹ اس کے پاس بیٹھ کے باہر نکلتے ہی میں نے یونہی برسبیل تذکرہ کیا۔

”اسی بلاک میں کہیں پھوپھو بھی رہتی ہیں۔“ پھر کچھ خیال آنے پر چونکنے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

”کشف! کیا خیال ہے پھوپھو سے ملنے نہ چلیں؟ ویسے بھی انہوں نے شام کو اوھر ہی آنا ہے اچھا ہے ہمارا ٹیکسی کا کرایہ بچے گا۔ ان کے ساتھ ہی گھر چلے چلیں گے۔“

تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ ہان گئی۔ گھر ڈھونڈنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی اور اس وقت تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب لان میں ہی شجاعت کو برا جمانا دیکھا۔ ہمیں گیٹ سے اندر داخل ہوتے کچھ کے اس کے چہرے پر جو اچانک خوشگواریت چھائی اس نے مجھے اطمینان دلادیا۔ ”اب منزل دور نہیں“ میں نے خود کو امید دلائی اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ اس کے بعد پھوپھو کا جو اگلا چکر لگا۔ اس میں وہ خاصی سنجیدہ تھیں۔ بھائیوں میں بیٹھ کر بڑی سنجیدگی سے انہوں نے ذکر چھیڑا۔

”بھائی جان! بار بار ایک ہی بات دہراتا اچھا نہیں لگتا۔ پھر بھی سوچا کہ دو ٹوک بات کر ہی لوں۔ آخر میں پاکستان اسی مقصد کے لیے تو آئی ہوں۔ میرے پاس دو ڈھائی ماہ ہیں اور ابھی تک ایک بیٹے کی بات بھی نہیں ٹھہرا سکی۔ آپ تو میرے ساتھ بالکل غیروں والا سلوک کر رہے ہیں۔ میں آپ کی اپنی ہوں۔ بھلا مجھ سے ایسا برتاؤ کرنے کی کیا ضرورت جو کہنا سے صاف سناں کیے۔ میں بالکل ناراض نہیں ہوں گی۔ آخر کوئی وجہ تو ہے جو آپ ٹالے جا رہے ہیں۔“

جواب میں بڑے ابونے بے حد شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں شبنم! تم کچھ غلط گمان مت کرنا۔ تمہارے بیٹوں میں کیا کمی ہے جو ہم بہانا بنائیں۔ یہ سب تمہاری اپنی بیٹیاں ہیں۔ جس پہ ہاتھ رکھو وہ تمہاری۔ بس بیلا کے سلسلے میں دیر کی وجہ صرف بیلا ہے۔ میں منتظر تھا کہ بیلا کا بھی کوئی مناسب پیام آجائے تو پھر ہاں کروں۔“

ہو کے طور پر ایسی ہی ذمہ دار گھریلو سی اور گھر لڑکی چاہیے۔“
کاش بیٹا نے اپنا یہ پرانا مشغلہ ترک نہ کیا ہوتا تو اپنے بارے میں اتنے اچھے تعریفی کلمات سن کر کھل جاتی۔

”اور رہا بھائی کا یہ عذر کہ وہ اپنی دونوں بیٹیاں مجھے دے کر اپنی بھتیجیوں کا حق نہیں مارنا چاہتیں تو۔ میں ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بیلا سے دستبرداری کا اعلان کرتی ہوں۔ لیکن شجاعت کے لیے دلہن میں بیس سے لے کر جاؤں گی، یہ دھیان رہے۔“
بیٹے کی ضد پہ بیلا کو طریقے سلیقے سے رو کرتے ہوئے انہوں نے بڑی امی یہ ساری بات ڈال دی۔ لو جی مسئلہ ہی حل، بیٹے کی خواہش بھی پوری اور کسی کو اعتراض کا بھی موقع نہ ملے گا۔ میں نے جی بھر کے پھوپھو کو دودھ دی۔ بیلا کو مبارکباد دینے کے بعد میں عطا کو فون کرنے مڑنے ہی والی تھی کہ فیصلہ آنٹی کی بات نے ہم دونوں کے قدم روک دیے۔

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

کہاں کا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کپور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف = 250 روپے

ملنے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی

”پتہ نہیں بھائی نے آپ سے ذکر کیا یا نہیں بہر حال میں بتا دوں کہ میں نے تو بیٹا کے لیے بھی صداقت کو آگے کیا تھا وہی نہ مانیں۔“
”ہاں شیریں نے سارا قصہ بتایا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا فیصلہ اپنی جگہ درست ہے۔“

”لیکن اب تو ماشاء اللہ شاداب کی بات بھی طے ہو گئی۔ انشاء اللہ باقی کا بھی اللہ سبب کرے گا اور اگر آپ صرف بیٹا کا سوچ کر تاخیر کر رہے ہیں تو۔ دیکھ لیں آپ کی مرضی کہ بیٹا ویس یا بیلا۔ دیکھیں بھائی جان! مجھے غلط مت سمجھیں۔ اگر میں کسی غیر کے گھر بیٹھی ہوتی تو شرم محسوس کرتی کیا پار پار بیان بدل رہی ہوں اور کبھی لپٹی، کبھی پیلا، کبھی بیٹا کا نام لے رہی ہوں لیکن آپ تو اپنے ہیں۔ گھر کی بات ہے۔ صرف بیٹے ہی میرے نہیں بیٹیاں بھی میری ہیں۔ اہل گھر کے بیٹے کر لیتے ہیں اس کو بھی۔ اب میں جو کتنے جا رہی ہوں وہ ذرا غور سے سنیں۔“

انہوں نے بے سلو بے لگ اور کھڑکی سے گلی بیلا اور میں نے ایک دوسرے کا ہاتھ منبھوٹی سے قلم لیا۔ میں دعا میں مانگ رہی تھی کہ وہی ہو جو میں نے سوچا ہے پھوپھو اپنے بیٹے کے مجبور کر سکتے۔ آئی ہوں۔
”ہاں تو میں کہہ رہی تھی بھائی جان! جب میں نے بیلا کی بات کی تو بیٹا تک منسوب بھی ورنہ قاعدے سے میں بڑی کا رشتہ ہی ڈالتی اور بڑے بیٹے کے لیے ڈالتی لیکن خیر۔ اب جب سب کچھ واضح ہے میں مزید دیر نہیں کروں گی۔ میں اپنے بڑے بیٹے صداقت علی کے لیے گل جین کا ہاتھ پالتی ہوں۔“

جو میں سننا چاہتی تھی وہ تو اب تک پھوپھو نے نہ اگلا تھا لیکن یہ خبر بھی کم دھماکہ خیز نہ تھی۔ بڑی امی اور بڑے ابو کے چہرے جگمگا اٹھے۔ ممکن ٹوٹنے کے بعد ہمارے معاشرے میں لڑکی کا دوبارہ رشتہ جڑنا اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پھوپھو کا یہ پیار بھرا مطالبہ انہیں جی جان سے قبول تھا۔

”صداقت اور گل بین کا جوڑا اچھا رہے گا، عمر، مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے بھی اور پھر مجھے اپنی بڑی

مبارکباد دینے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بیلا کی طرف دیکھا۔ اس بے چاری کی تو وہ حالت ہو گئی تاکہ آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا۔ سامنے کھائی پیچھے جنگل۔ نہ اگلے بنے نہ نکلے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سارے محاورے فٹ کرتے ہوئے جیسے ہی میں نے نظر گھمائی۔ خوشی اور شرم سے گلزار چہرے کے ساتھ وہ آنچل کا کونا دانتوں تلے لیے مسکرا رہی تھی۔
 ”کھنی، میسنی، چالا کو۔“ میں نے اسے پیٹ ہی تو ڈالا۔



اور آج چودھری ہاؤس میں چاند رات الگ ہی ڈھب سے اتری تھی۔ اس سے پہلے ان درو دیوار پہ اتنی رونق نے ڈیرا نہ ڈالا تھا اور نہ ہی کسی نے ایسی سرشاریاں دیکھی تھیں۔
 مجھے اس گھر میں گزری کتنی ہی چاند راتیں یاد تھیں۔

بچپن کی وہ بھولی بھالی سی چاند راتیں بھی۔ جن میں بڑی امی کے سنے چھوٹے چھوٹے زرق برق لہنگے اور بڑے پیپا کے فارن سے لائے پھولے پھولے فراک ہم سب بار بار ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے۔
 میں اس کی دسی پر جوش چاند راتیں بھی تھیں، جیسی اب کائنات، سیماب اور حمنہ مناتیں، جس میں دوستوں کو دی جانے والی عیدی کی پیکنگ اور صبح ملنے والی نقد عیدی کی چاہ تھی۔
 اور پچھلی کئی چاند راتیں۔ مل کر جوڑیاں چڑھانا، ایک دوسرے کو مندی لگانا، ٹیلر کے چکر کاٹنا، بڑی امی کے بنائے شیر خرما کے لیے بادام اور پستے کی ہوائیاں کاٹنا۔
 لیکن یہ چاند رات سب سے جدا تھی۔

سب سے مفرد۔

بالکل البیلی۔

اس میں چودھری ہاؤس کی ایک نہ دو پوری پانچ

”ہرنجی اپنی قسمت لکھوا کر لاتی ہے شیریں بھابھی! یہ آپ کی محبت ہے جو آپ نے ان کے بارے میں ایسا سوچا لیکن بیلا کے لیے ایک بار پھر سوچ لیں۔ کیا حرج ہے اگر دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں چلی جائیں۔“
 جہاں شبنم پھوپھو سارا کھیل چوٹ ہوتے دیکھ جز بڑھوئیں وہاں میں اور بیلا بھی سر پکڑ کر آنٹی فنیسلہ کو دیکھنے لگے۔

”جہاں آپ پچھلے ایک گھنٹے سے خاموش بیٹھی تھیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر مزید کچھ دیر اور چپ رہتیں۔“

”بہن۔ بیلا بھی کچھ رضامند نہیں۔“ رابعہ آنٹی نے پھوپھو کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر کہا، بڑی امی البتہ بیٹی کی سرکشی، عیاں ہونے کے خوف سے سٹیٹا کے کہنے لگیں۔

”وہ تو دراصل شبنم! بیلا نادان بہت ہے، بچپنا بہت ہے اس کے اندر سات سمندر پار جانے سے گھبرا رہی تھی۔“

”اس لیے میری رائے ہے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے چودھری ہاؤس میں ہی رہنے دیا جائے۔“ رابعہ آنٹی کی رائے پہ بڑی امی اور بھابی ہر اسل ہو گئیں۔

”اے بے رابعہ! دیوانی ہوئی ہو، وہ تو پاگل ہے، اعلان کر بیٹھی ہے مرتے مر جائے گی، یہ گھر نہ چھوڑے گی۔ کیا تم بھی اس کے ساتھ عقل گنوا بیٹھی ہو۔ ساری عمر کنواری بٹھائے رکھنا ہے اسے۔“

”میں نے یہ کب کہا بھابھی! میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ اسے چودھری ہاؤس سے نہیں نکلنے دینا اور رہی بات شادی کی تو آپ کیوں بھول جاتی ہیں کہ اللہ کے فضل سے اس گھر میں بھی ایک جوان بیٹا موجود ہے۔ کم از کم اپنی ایک بیٹی کو تو ہم سدا اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں۔“

رابعہ آنٹی نے تو سارا پروگرام ہی ترتیب دے ڈالا۔ ہر شخص ہلکا پھلکا سا ہو کر ایک دوسرے کو

آچل تھا جو لڑکے کی ماں بات بچی ہو جانے کے بعد لڑکی کے سر پہ شگن کے طور پر ڈالتی ہے۔

شاداب بچ مچ شاداب ہی تو لگ رہی تھی، کھلے ہوئے پنک کمر کے سوٹ پہ ڈل گولڈن اور شاکنگ پنک دھاگے سے خوب صورت کڑھائی تھی۔ عروج بار بار اس کے ماتھے پہ آتی لمبی سی لٹ درست کرتی۔ سونے کے بھاری جھمکے ڈول ڈول کر اس کے رخساروں پہ سرے سائے لہرا دیتے تھے۔

اور وہ بیسنی، گل بیلا، مندی، اینٹن، چوڑی سے ارجک، رابعہ آنٹی کے پہلو میں دبکی کیسے کھلی پڑ رہی تھی۔ لائٹ گرین اور سی بلیو کے امتزاج سے تیار اس کا جارحٹ کا سوٹ خوب اٹھ رہا تھا۔ اس کی گندمی رنگت پہ سرخ آچل کی پھولی پھولی اوٹ سے گھنے گھنگھریالے بالوں کے کچھتے کچھتے دلکش لگ رہے تھے۔

اور یہ۔۔۔ سحاب چودھری۔۔۔ لائٹ پریل اور ڈارک گرین کے کنٹراسٹ سے سجا سفید موتیوں کے کام والا سوٹ پہنے، سفید موتی جڑا ہلکا سا سونے کا سیٹ پہنے، یہ۔۔۔ میں ہوں سحاب چودھری اور میرے سر پہ شجاعت علی کے نام کا آچل پھیلا ہوا ہے۔ جی ہاں۔۔۔ سب کچھ سمجھ لینے کا دعویٰ کرنے والی سحاب چودھری، شجاعت علی کی آنکھوں کی بے تابیوں اور لبوں کی شوخ مسکرائشیں بھانپ نہ سکی اور کشف کی راہ ہموار کرتے کرتے خود اس زگوٹا جن، قباچہ اور ڈنٹونک کے ٹریڈ مار کے دل کی دنیا تہ وبالا کر گئی۔

جاننے ہیں کشف کا کیا ہوا۔۔۔ وہ جو اس دن میں اسے پھوپھو کے سرال لے گئی تھی نا۔ تو ان کی جھٹھالی نے اپنے ”چونگے کے بیٹے“ پروفیسر بیٹے کے لیے اسے۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ مندی، چوڑی اور آچل میں حصہ دروہ بھی ہے، بس ذرا کچھ انتظار۔۔۔ بھئی آخر اگلی چاند رات کو بھی تو رونق لگنی چاہیے۔



بکریاں شگن کے لال روئے اوڑھے بیٹھی تھیں۔

یہ شوہ سب سے پہلے شاداب کے سرال کی طرف سے چھوڑا گیا۔ وہ لوگ اپنی بسو کے لیے عیدی لانا چاہتے تھے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اجازت دے دی گئی۔

یہ خبر ڈاکٹر عمر کی والدہ تک پہنچی تو وہ پیچھے کیوں رہیں، انہوں نے بھی سارے ارمان نگالنے کا ارادہ کرتے ہوئے آنے کا عندیہ ظاہر کیا۔

بیجے اب بھلا پھوپھو کو اپنی دونوں بسو میں کیا کم عزیز تھیں۔ وہ بھی میدان میں اتریں۔

ان کی ریکھا دیکھی رابعہ آنٹی نے بھی عطا کی رہنمائی کے لیے عید کے تحائف خرید ڈالے۔ اب چاند رات کو ایک چھوٹی سی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں تمام رشتوں کو باضابطہ ملے کرتے ہوئے خاندان بھر کے چیدہ چیدہ افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عمر رحمان اور عامر بٹ کے گھر والوں کو عید کے تین ہفتے بعد کی تاریخ دے دی گئی تھی۔ اس کے اگلے مہینے پھوپھو صداقت علی کی بارات لائیں گی جبکہ شجاعت اور عطا کو اس موقع پر منتقلی پہ ہی فی الحال رخصت کیا جائے گا۔ بقایا دو شادیاں اگلے سال تک کے لیے رکھ دی گئیں۔

تیج کمر کے خوب صورت شیفون کے شلوار قمیص میں ملبوس گل لیلیٰ آپنی کتنی اچھی لگ رہی تھیں رنگوں سے نا آشنا ان کا چہرہ ہلکے ہلکے میک اپ اور لباس پہ موجود سلور کڑھائی کی مناسبت سے پسے جانے والے ڈائمنڈ سیٹ کے ساتھ کتنا حسین لگ رہا تھا۔

ان کے برابر بیٹھی گل بین کتنی مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھی۔ شاداب نے اس کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا اسے کسی سے کوئی محبت و جت نہیں تھی واقعی صداقت سے منسوب ہونے کے بعد وہ ”سیونی میرا ماہی مینوں ہیر بناون آگیا“ گنگنائی پھر رہی تھی۔ راکل بلیو سلک کے کرتا یا سجامہ پر چنا ہوا گولڈن اور بلیو ویسٹ لیے وہ دمک رہی تھی۔ سر پہ ہمارا روایتی سرخ